وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ

اختلاف اللسان

یعنی

دہلی اور لکھنؤ کی زبان کے الفاظ اور محاورات کا فرق

مؤلفہ

منشی وجاہت حسین صاحب وجاہت صدیقی جھنجھانوی

سنہ ۱۹۰۶ء

رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور میں چھپا

قیمت .... فی جلد ۱۰/

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ جس نے ہمیں عقل و گویائی عطا فرما کر اشرف المخلوقات
بنایا اور اُس نبی کی اُمّت میں پیدا کیا جس پر نہایت فصیح و بلیغ کتاب نازل ہوئی۔ یہ
دراصل قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت ہی کا معجزہ تھا جس سے عرب کے مستند اور مسلم الثبوت
فصحا عاجز ہوئے اور باوجود اِدّعائے زباندانی و قدرت کلام سب کے مُنہ پر مُہرِ خاموشی
لگ گئی۔ اللہ اللہ! کلام الٰہی میں عجب تاثیر ہے جس نے عرب کی جنگ جُو۔ وحشی اور
بُت پرست قوم کو چشم زدن میں رام کر لیا۔ اس کامیابی کے اسباب کسی اَور کے نزدیک
خواہ کچھ ہی ہوں مگر میں تو یہی کہونگا کہ یہ سب فصاحت و بلاغت کے کرشمے تھے۔ یہ بڑے
تماشے کی بات ہے کہ ایسی فصیح و بلیغ ایسی جامع و مانع ایسی موثر و نایاب کتاب جس
شخص پر نازل ہوئی وہ شخص اُمّی تھا۔ مگر اللہ کے بھید اللہ ہی جانے اُسی اُمّی رسولؐ
کی زبان سے خدا کا کلام ہم تک پہنچا۔ اور اُسی نے ہمیں فصاحت و بلاغت اور حُسنِ
بیان کے طریقوں کی طرف رہبری کی۔ پس مسلمان شاعر ہونے کی حیثیت سے ہمارا
فرض ہے۔ کہ اس احسان کے لئے خدا کا شکر ادا کریں اور اس کے برگزیدہ نبیؐ
کے الطاف و اکرام کا اعتراف کرتے ہوئے اُن پر درود و سلام بھیجیں۔ یہی
ہماری حمد ہے اور یہی ہماری نعت۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ

تمہید

دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں الفاظ و محاورات کا جو فرق ہے وہ ناظرین کو آیندہ اوراق کے ملاحظہ سے معلوم ہوگا۔ مگر تاثیر کلام کے لحاظ سے بھی ان دونوں شہروں کی زبان میں ایک بیّن تفاوت پایا جاتا ہے۔ چونکہ اُس کا بیان اصل کتاب میں نہیں آیا۔ لہٰذا اس موقع پر اس کے متعلق کچھ تذکرہ کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

زبان دہلی کا سب سے اعلےٰ اور سب سے پہلا نمونہ (نظم میں) خدائے سخن میر تقی دہلوی کا کلام ہے ان کے اشعار بلحاظ سلاست و نفاست زبان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اور ان میں درد و یاس حسرت و افسوس اور سوز و گداز کی نہایت دلکش و موثر تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ گویا اِن کی شاعری کی بُنیاد انہیں چند باتوں پر رکھی گئی تھی۔ اگرچہ میر تقی مرحوم جملہ اصناف سخن پر بخوبی حاوی تھے اور ان کے ضخیم و حجیم کلیات میں غزل قصیدہ مثنوی وغیرہ ہر رنگ کا کلام موجود ہے۔ مگر سچ پوچھئے تو یہ کُل مجموعۂ سخن میر صاحب کی شہرت میں زیادہ دخل نہیں رکھتا۔ اُن کی مقبولیت کا بڑا ذریعہ صرف ان کی غزل گوئی قرار دی جاسکتی ہے۔ کہنے کو انہوں نے سب کچھ کہا اور ہر طرح پر اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا مگر جس خاص بات نے اُن کو شہرت کے پر لگا کر اُڑایا وہ صرف ایک ہی صنفِ سخن یعنی غزل گوئی سے بہت بڑا تعلق رکھتی ہے۔ اس خدائے غزل نے اپنے اشعار میں وہ قدرتِ سخنوری دکھائی کہ بے چون و چرا ہر شخص کو ان پر ایمان لانا پڑا۔ اور اس شاعر کے لئے یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں کہ ہندوستان میں جو شعرا گزر چکے ہیں جو موجود ہیں اور جو آیندہ ہونگے وہ سب اس کی استادی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے رہیں گے اور ان کو فن سخن کا مسلم الثبوت استاد مانتے رہیں گے۔

اب دیکھنا چاہئے کہ میر کو گروہ شعراء میں جو یہ غیر معمولی وقعت دی جاتی ہے اسکا
اصل سبب کیا ہے؟ پہلے یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ ان کی شہرت کا باعث اُن
کی غزلیات ہیں اور غزلیات اس وجہ سے مقبول عام ہوئیں کہ وہ جوہر تاثیر سے مالامال
ہیں اب تاثیر کے مختلف پہلوؤں پر نگاہ ڈالنی چاہئے۔ غالباً ناظرین کو اس کا اندازہ
کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے۔ کہ میر نے اپنی غزلوں
میں جو زبان استعمال کی ہے اُس میں فصاحت وسلاست اور سادگی و شیرینی کا خاص
حصّہ موجود ہے اور ان سب پر طرّہ شاعر کا انداز بیان ہے جس میں ایک خاص قسم کا
درد پایا جاتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ہر شعر ایک چوٹ کھائے ہوئے دل سے نکلا
ہے۔ اور یہی وہ خصوصیت کلام ہے جس نے میر کے نام کو چمکایا اور پبلک نے
اپنا گرویدہ بنایا*

قصیدے یا مثنوی کے لئے میر صاحب کا نام خصوصیت سے نہیں لیا جاتا
اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جس شخص نے محض آہ و بیکسی کو اپنے کلام کا جزو اعظم قرار دیا ہو
وہ قصیدے میں لفظی شان و شوکت کماحقّہٗ نہیں دکھا سکتا۔ گو قصیدے کے اشعار
کی ترتیب بھی ردیف و قافیہ کے لحاظ سے غزل ہی کی طرح ہوتی ہے۔ مگر فرق یہ
ہے کہ عموماً قصیدے میں غزل سے زیادہ اشعار ہوتے ہیں اور بلند و عالمانہ۔ بلیغ و
اوق مضامین خاص کوشش سے باندھے جاتے ہیں۔ اس میں آمد کم اور آورد زیادہ
ہوتی ہے نتیجہ یہ ہے کہ اور نظمیں اگر شاعر کے جذبات کو ظاہر کرتی ہیں۔ تو قصیدہ شاعر
کی محنت کا ثبوت دیتا ہے اگرچہ شاعروں نے قصاید کی تمہید میں تشبیب اور تغزل
کو بھی داخل کر دیا ہے۔ جس سے اظہار جذبات کا کم و بیش موقع مل جاتا ہے مگر واقعی
بات یہ ہے کہ قصیدے کے شکنجے میں پھنس کر تشبیب میں بھی ایک خاص قسم کی
آورد پیدا ہو جاتی ہے۔ میر تقی مرحوم نے متعدد قصیدے لکھے ہیں مگر منددجہ بالا

وجوہ کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ ان کے قصاید غزلیات کے سامنے زیادہ فروغ نہیں پاسکے۔ قصیدے میں سوداؔ کا نمبر میرؔ سے بڑھا چڑھا نظر آتا ہے۔ مگر غزل میں مرزا رفیع کا پایہ میرؔ سے نیچا ہے۔ اور اسی خیال سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ گویا میر تقی کی شاعری پر دلی کی شاعری کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ میر صاحب کے وقت میں یا میر صاحب کے بعد جتنے شاعر خاک پاک دہلی سے اُٹھے سب نے اسی سلاست وسادگی اور آہ وبیکسی کو اپنی شاعری کا دستور العمل قرار دیا۔ یہ اس لئے کہ میر صاحب کا رنگ عام پسند تھا اور اُس کے سامنے اُن کے ہمعصر شعرا کا کلام سرسبز نہ ہوتا تھا۔ خواجہ میر دردؔ کے کلام کو دیکھو وہ ایک صاحب باطن شاعر تھے ان کا ہر شعر ایک خاص قسم کی تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے گویا مصرع مصرع میں کوٹ کوٹ کر درد بھر دیا ہے۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہئے کہ ان کی شاعری اُن کے تخلص کے لحاظ سے اسم بامسمّٰی ہے۔ میر سوزؔ کا کلام بھی سوز وگداز میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ جراتؔ کی شاعری میں دردؔ کا تو زیادہ حصہ نہیں البتہ سلاست وسادگی اور معاملہ بندی میں ان کی نظر بھی نہایت وسیع ہے ؁

یہ بات سب جانتے ہیں کہ زبان اردو کا مولد ہندوستان کا قدیم دار السلطنت شہر دہلی ہے اس کے بعد اردو کی فصاحت وبلاغت اور الفاظ ومحاورات کی سند کے لئے شاہان اودھ کے دار الحکومت لکھنؤ کا نام لیا جاتا ہے۔ جب تک دلی بنی رہی اس کی بات نہیں بگڑی۔ لکھنؤ کے اہل زبان بھی برابر اسی شہر کو سکہ اردو کی سمجھتے رہے مگر جب انقلاب دوراں کی تاثیر سے دلی کے اقبال کا ستارہ زوال میں آیا تو لکھنؤ کا نصیب چمک اُٹھا ؁

دہلی مرحوم بھی عجیب شہر ہے بگڑ بگڑ کر بنا اور بن بن کر بگڑا۔ اہل کمال بھی اس انقلاب سے متاثر ہوئے اور جب انہیں یہاں کچھ ٹھکانا نظر نہ آیا تو چار ناچار اپنا بوریا بستر

باندھ کر لکھنؤ کی طرف رُخ کرنا پڑا۔ اور جو گیا ایسا گیا کہ بس وہیں کا ہو رہا۔ مشہور شعرا میں غالباً سب سے پہلے مرزا رفیع سودا لکھنؤ تشریف لے گئے۔ ان کی وفات کے بعد میر تقی نے قدم رنجہ فرمایا۔ پھر میر حسن۔ میر سوز۔ جرأت وغیرہ بھی پہنچ گئے۔ نواب آصف الدولہ جیسے سخی فرماں روا کا دور دورہ تھا اہل کمال کی خوب خوب قدر دانیاں ہوئیں +

امام الشعراء شیخ امام بخش ناسخ کے ابتدائی زمانے تک دلی اور لکھنؤ کی زبان ایک رہی مگر پھر شیخ مغفور نے ایک جدا راستہ نکالا اور زبان اردو کے الفاظ و محاورات میں ایسی کاٹ چھانٹ کی کہ لکھنؤ کی زبان دہلی کی قید تقلید سے آزاد ہو کر بجائے خود ایک مستند زبان بن گئی۔ اہل لکھنؤ نے صرف یہی نہیں کیا کہ دہلی کے بعض الفاظ و محاورات میں ترمیم و تنسیخ کے ذریعہ سے نئی روح پھونکی ہو بلکہ اپنی طرف سے بھی نئے نئے الفاظ و محاورات "جو زبان دہلی سے بالکل مختلف ہیں" ایجاد و اختراع کیے اس اجتہاد کی وجہ سے دہلی کی طرح لکھنؤ کی زبان بھی علیحدہ سمجھی جانے لگی اور اہل لکھنؤ زبان اردو میں قریب قریب برابر کے حصہ دار ہو گئے + الفاظ و محاورات کے علاوہ اہل لکھنؤ نے زبان دہلی کی تقلید کا جوا کندھے سے پھینک کر جو طریق سخن اختیار کیا وہ بھی اہل دہلی سے بالکل جداگانہ ہے۔ وہاں سلاست سادگی اور فصاحت و محاورات کو حسن کلام کا زیور سمجھا گیا تو یہاں ان باتوں کے علاوہ شوکت و رعایت لفظی اور رنگینی و صناعی کا بھی خاص خیال رکھا گیا۔ اور اس وصف میں یہاں تک ترقی ہوئی کہ اہل دہلی و اہل لکھنؤ کے کلام میں نمایاں فرق نظر آنے لگا

اب دیکھنا چاہئے کہ اہل لکھنؤ نے کس کس صنف سخن میں کیا کیا ترقی کی۔ اس امر کا اندازہ کرنے کے لئے ہم سب سے پہلے قصیدے پر نگاہ ڈالتے ہیں یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ شوکت الفاظ اور بلندیٔ مضامین اہل لکھنؤ کا خاص حصہ ہے اس لئے چاہئے تھا کہ اہل لکھنؤ اہل دہلی پر خصوصیت سے فوق لے جاتے کیونکہ قصیدہ گوئی کے لئے جو باتیں لازمی ہیں وہ اہل لکھنؤ کے ہاں اول روز سے موجود تھیں گویا اہل لکھنؤ

اس کام کے اہل تھے۔ مگر دیکھا جاتا ہے کہ اہل لکھنؤ نے اس صنف میں اہل دہلی سے بڑھکر جوہر نہیں دکھائے اگر کوئی شخص اچھے قصاید دیکھنے کا آرزومند ہو تو وہ شعرائے دہلی کے دواوین سے اپنی خواہش پوری کرسکتا ہے۔ لکھنوی شعراء کے دواوین میں اول تو سرے سے قصاید ملیں گے ہی نہیں اور جو کوئی ملا بھی تو اس کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ گویا شاعر نے اپنی طبیعت پر بے انتہا جبر کرکے چند شعر نکالے ہیں البتہ منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی چند نعتیہ اور عشقیہ قصاید نہایت عمدگی سے لکھ گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اہل لکھنؤ نے اس جانب توجہ ہی نہیں کی اور اپنا زور طبیعت غزل گوئی میں صرف کردیا۔

شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی نے تشبیہات و استعارات کے ذریعہ سے غزلیات میں جو خوبی پیدا کی ہے وہ انہیں کا حصہ تھا۔ ان کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے جذبات حسن و عشق کا اظہار کرنے میں خاص احتیاط سے کام لیا ہے اور حتی الوسع خلاف تہذیب و مخرب اخلاق مضامین کو اپنے اشعار میں نہیں آنے دیا۔ خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی کی آتش بیانی بھی قابل ذکر ہے ان کا کلام ناسخ کے کلام سے مختلف ہے۔ زبان کی فصاحت و بلاغت کے علاوہ ان کے اشعار میں تاثیر بھی پائی جاتی ہے۔ ان کے بعد لکھنؤ میں جو شاعر ہوئے انہوں نے زبان کی شستگی و صفائی کا تو برابر خیال رکھا۔ مگر ان کا مذاق سخن (غالباً سوسائٹی کے اثر کی وجہ سے) روز بروز عامیانہ ہوتا چلا گیا۔ وصل و ہجر کے جذبات کا اظہار اکثر موقعوں پر حد تہذیب سے باہر ہو گیا۔ انگیا۔ کرتی۔ محرم۔ جوبن وغیرہ کا تذکرہ جن کھلے الفاظ میں کیا گیا ہے ان کو دیکھ کر تہذیب آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ بہر حال عام طور پر شعرائے لکھنؤ نے غزلیات میں ناز کرشمے یا بقول شخصے آئی اوئی کے مضامین زیادہ باندھے ہیں اور ایسے مضامین کے لئے جیسی زبان درکار ہے وہ لکھنؤ میں ضرورت سے زیادہ موجود تھی۔

افسوس ہے فرداً فرداً ہر شاعر کے کلام پر ان مختصر اوراق میں رائے ظاہر کرنے کی گنجائش نہیں مگر تاہم میں دو تین شخصوں کا نام خصوصیت سے لینا چاہتا ہوں - ان میں سب سے پہلے امانت لکھنوی ہیں - ان کا ہر شعر گویا ایک پھلجھڑی ہے - زبان کی صفائی - محاورے کی ستھرائی - اس پر رعایت لفظی کا انہوں نے جو خاص التزام کیا ہے وہ ہر طرح قابل داد ہے + پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی کا کلام بھی لکھنؤ کی شاعری کا مکمل نمونہ ہے - گو بعض وجوہ سے بعض متعصب اصحاب ان کے کمال کی کما حقہٗ قدر نہ کریں مگر میرے نزدیک شعرائے لکھنؤ میں ان کا پایہ کسی دوسرے شاعر سے کم نہیں - انہوں نے بھی رعایت لفظی پر خصوصیت سے توجہ کی اور ایک بڑی حد تک اُس میں کامیاب بھی ہوئے - اس گئے گذرے زمانے میں منشی امیر احمد صاحب کا دم بھی غنیمت تھا - ان کا کلام درد و تاثیر سے مالا مال ہے +

اُردو میں بہت سی مثنویاں لکھی گئیں - جن میں میر حسن کی بدر منیر - پنڈت دیا شنکر کی گلزار نسیم - نواب مرزا شوق کی بہار عشق - زہر عشق - قلق کی طلسم الفت - احمد علی شوق کی ترانہ شوق - نواب مرزا خاں داغ کی فریاد داغ اور منشی امیر اللہ تسلیم کی مثنویاں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں - مگر اول الذکر دونوں مثنویوں کے سامنے باقی مثنویوں کا رنگ نہیں جما اردو میں اب تک جو مثنویاں تصنیف ہوئی ہیں انہیں حسن و عشق کی داستانیں اکثر اوقات غیر مہذب پیرایہ میں ظاہر کی گئی ہیں - کسی دوسرے مضمون پر اُردو میں مثنوی لکھی ہی نہیں گئی - اس خیال سے کہا جا سکتا ہے کہ شعرائے ہند نے مثنوی گوئی میں زیادہ ترقی نہیں کی - بدر منیر اور گلزار نسیم جن میں سے پہلی کا مصنف ایک دہلوی شاعر ہے اور دوسری کا لکھنوی - دونوں شہروں کے انداز کلام کا فرق بخوبی ظاہر کرتی ہیں +

مسدس کا رواج مُلک میں زیادہ ہوا - اردو میں عاشقانہ رنگ کے سیکڑوں واسوخت

(مسدس) لکھے گئے۔ مگر اس کے لئے شعرا کو ایک محدود دائرے میں گردش کرنی پڑی واسوخت کے سارے مضمون کا لب لباب یہ ہے کہ معشوق عاشق سے ناراض ہو گیا۔ عاشق نے دوسرا معشوق ڈھونڈھ لیا اور اس کی بے انتہا تعریفیں کر کے پہلے معشوق کو جلایا۔ آخر وہ راہ پر آگیا۔ خوبی مضامین کے لحاظ سے اردو میں ایک واسوخت بھی قابل ذکر نہیں۔ البتہ مسدس کی دوسری قسم یعنی مرثیہ گوئی میں شعرائے اردو نے خاص ترقی کی ہے یہ مثل قدیم سے مشہور چلی آتی تھی۔ کہ "بگڑا گویا قوال اور بگڑا شاعر مرثیہ گو۔ مگر اہل لکھنو نے مرثیہ میں وہ خوبی پیدا کی کہ یہ مثل یکقلم غلط ہو گئی۔ اب کسی اچھے شاعر کو بھی ایکا ایکی مرثیہ لکھنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ میر انیس اور مرزا دبیر لکھنوی نے مسدس کی اس ایک قسم یعنی مرثیہ گوئی میں ایسی ترقی کی کہ اس فن کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔ ہمیں اس بات کے ظاہر کر دینے میں کچھ تامل نہیں کہ گویا شعرائے لکھنؤ نے اس صنف سخن میں شعرائے دہلی سے قلم رکھوا لئے ہیں۔

مرزا غالب جیسا قادر الکلام اور طباع سخنور انیس و دبیر کی موجودگی میں مرثیہ لکھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ اہل دہلی میر انیس کے مراثی کو زیادہ پسند کرتے ہیں انکا خیال ہے کہ میر انیس نے لکھنؤ میں رہ کر نہ صرف سلاست و فصاحت کے لحاظ سے بلکہ الفاظ و محاورات کی رو سے بھی زبان دہلی کو اپنی شاعری کا دستور العمل قرار دیا تھا۔ یہ بات سچ ہو یا غلط مگر ہمارے انیس و دبیر کے کلام میں وہ فرق ضرور موجود ہے جو ایک دہلوی اور لکھنوی شاعر کے کلام میں ہونا چاہئے۔

نثر کے متعلق اسی قدر کہنا کافی ہے کہ میر امن دہلوی کی چار درویش اور مرزا رجب علی سرور لکھنوی کی فسانہ عجائب یہ دو کتابیں خصوصیت سے مشہور ہیں۔ اور دونوں اس وقت کی زبان دہلی و لکھنؤ کا پورا پورا ثبوت دیتی ہیں۔

مرزا غالب دہلوی نے اپنے دوستوں۔ رشتہ داروں کو خطوط لکھ کر ایک نئی قسم

کی نثر کا آغاز کیا۔ جس کی آج تک تقلید کی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ سرسید احمد خاں مرحوم۔ مولوی ذکاء اللہ۔ مولوی نذیر احمد مدظلہ نے نثر کو معراج کمال پر پہنچایا۔ اور ان سب سے زیادہ دیوانۂ اُردو مولوی محمد حسین آزاد دہلوی نے اُردو نثر پر احسان کیا ہے۔ انکے مقابلے میں لکھنؤ کوئی باکمال میدان میں نہیں لاسکا۔ البتہ فسانہ نگاری اور ناول نویسی میں اہل لکھنؤ نے خاص ترقی کی ہے۔ پنڈت[۱] رتن ناتھ سرشار لکھنوی کے فسانے اپنی نوعیت میں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مولوی عبدالحلیم شرر کے ناول بھی ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان باتوں میں لکھنؤ کا درجہ دہلی سے ممتاز نظر آتا ہے۔ ظرافت میں بھی اہل لکھنؤ نے اہل دہلی سے زیادہ ترقی کی ہے۔ بہرحال اہل لکھنؤ کا دعوےٰ زباندانی محض زبانی نہیں۔ بلکہ انہوں نے کچھ کرکے بھی دکھایا ہے۔

اس مضمون پر کتاب لکھنے کا خیال مجھے عرصہ سے تھا۔ مگر ہر کام کے لئے ایک وقت ہوتا ہے۔ اب اس کام کا بھی وقت آگیا تھا۔ خاص خاص زباندان یا اہل زبان اس بات کا شاید کچھ اندازہ کرسکتے ہوں کہ دہلی و لکھنؤ کی زبان میں کیا فرق ہے عام طور پر تو دہلی و لکھنؤ کے رہنے والے بھی اس فرق سے بہت کم واقف ہونگے۔

دہلی کے بعض حضرات نے ہمارے بعض الفاظ و محاورات پر اعتراض کئے۔ کہ اس طرح اہل لکھنؤ باندھتے ہیں۔ اہل دہلی نہیں بولتے۔ پھر تم جو زبان دہلی کا اتباع کرتے ہو ایسا کیوں لکھتے ہو۔ بلکہ ایک مرتبہ استادی حضرت داغ مغفور نے بھی

---

[۱] بعض خوش فہم سرشار و شرر کی خصوصیات کا اظہار کرتے ہوئے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک دونوں کا رنگ انشا پردازی انوکھا ہے اور دونوں ایک طرز خاص کے موجد ہیں۔ اگر سرشار ہندو تھے تو یہ ضرور نہیں کہ خواہ مخواہ بھی مسلمان ایک آدمی کو انکا مدمقابل بناکر اس کمی کو پورا کریں سرشار کو شرر سے کچھ نسبت نہیں اپنے اپنے کمال میں دونوں یکتا ہیں

لفظ حضور کے استعمال پر راقم کو یہ لکھا تھا۔ کہ اہل دہلی معشوق کو اس لفظ سے مخاطب نہیں کرتے یہ اہل لکھنؤ کا دستور ہے۔ آخر کسی قدر غور و تامل کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ دہلی کے باشندے لکھنؤ کی زبان کو اور لکھنؤ کے باشندے دہلی کی زبان کو استعمال کرنے سے بوجوہات چند در چند معذور ہیں۔ مگر بیرونجات کے زباندان عام اس سے کہ وہ زبان دہلی کے مقلد ہوں یا زبان لکھنؤ کے اگر دونوں جگہ کے الفاظ و محاورات استعمال کرنے لگیں تو کیا مضایقہ ہے ؟

میں نے کم و بیش تین سال کی لگاتار محنت کے بعد کچھ اپنی ذاتی واقفیت اور کچھ مختلف کتابوں کی مدد سے یہ چند الفاظ و محاورات زبان دہلی و لکھنؤ کے متعلق جمع کئے ہیں۔ ان الفاظ کا بہم پہنچا لینا چنداں دشوار نہ تھا۔ مگر ان کی سند کے لئے جسقدر کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑی وہ حقیقت میں ایک اہم کام تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس مضمون پر اس سے پہلے اُردو زبان میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ میں اپنے شوق اور معلومات کو وسعت دینے کی غرض سے یہ ذخیرہ فراہم کرتا رہا۔ آخر کار ایک مدت کے بعد اس قسم کے الفاظ کافی تعداد میں جمع ہو گئے۔ اور یہ مناسب سمجھا گیا کہ یہ مجموعہ چھپوا کر پبلک میں پیش کیا جائے ؁

میں نے ہر لفظ کی تصحیح و طریق استعمال کے متعلق حتی الوسع احتیاط سے کام لیا ہے۔ مگر پھر بھی ابتدائی کام میں جو فروگذاشتیں ہو جانی ممکن ہیں اُن سے میں اس کتاب کو خالی نہیں سمجھتا۔ جو زباندان یا اہل زباں خاکسار مولف کو کسی لفظ یا محاورے کے متعلق مفید مشورہ دینگے ان کا دلی شکریہ ادا کیا جائے گا اور انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں تصحیح کر دی جائے گی ؁ فقط

خاکسار

وجاہت صدیقی جھنجھانوی

لاہور۔ دسمبر ۱۹۰۶ء

۷۸۶

حرف الف

آغوش ۔ بغل ۔ گود ۔ کنار ۔ پہلو ۔ لکھنؤ میں مذکر بولا جاتا ہے ۔ ؎

وصل کی شب ہم نے شادیٔ مرگ ہو کر دی جاں
تنگ مرقد سے پہ ہمارے گور کا آغوش ہے

ہیں وہ محرم محبت ہوں لڑکپن میں بھی
واکسی نے نہ مرے واسطے آغوش کیا

کب تک بغل میں پالے ہوئے دل کو روئیے
خالی نہیں ہزاروں کے آغوش ہو گئے

منشی سید احمد صاحب دہلوی نے فرہنگ آصفیہ میں آغوش کو مذکر لکھا ہے اس کے متعلق صاحب فصیح اللغات نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ یا تو یہ کاتب کی غلطی ہے یا حقیقتاً میں اہل دہلی بھی اس لفظ میں اختلاف رکھتے ہیں حضرت استاد مرحوم (فصیح الملک داغ دہلوی) نے فرہنگ آصفیہ میں آغوش کو مذکر چھپا ہوا دیکھ کر قافیہ و ردیف کے لحاظ سے یہ لفظ مونث کہا ہے ۔ ؎

سنتا ہی نہیں وہ بتِ مے نوش ہماری　　خالی ہے شبِ وصل بھی آغوش ہماری (داغ دہلوی)

اہل دہلی آغوش کو عموماً مونث ہی بولتے ہیں فرہنگ آصفیہ میں جو اس کو مذکر لکھا ہے تو یہ یقیناً کتابت کی غلطی ہے۔ کیونکہ ایسی غلطیاں کتاب مذکورہ میں اکثر پائی جاتی ہیں دہلی کے شعرائے متاخرین میں سے داغ مرحوم کا شعر تانیث آغوش کی کافی سند ہے۔ دو شعر اور بھی درج کئے جاتے ہیں۔ ؎

شاہد مقصود ہے کس کی بغل میں اے ظفر دیکھ ہے آغوش چرخ پیر بھی خالی پڑی (ظفر دہلوی)

آغوش گور ہو گئی آخر لہو لہان آساں نہیں ہے آپ کے بسمل کو تھامنا (مومن دہلوی)

اس قدر ثبوت کے بعد اس باب میں کچھ شک نہیں رہ سکتا کہ اہل دہلی آغوش کو مونث کہتے ہیں۔ ؎

اُبٹن۔ غازہ۔ بٹنا۔ لکھنو میں اُبٹن کہتے ہیں اور دہلی میں بٹنا یا اُبٹنا بولتے ہیں۔ ؎

دامن میں رشک گل کے اُڑی باغ میں جو خاک
بٹنا وہ بن گئی ہے عروس بہار کا [illegible]

اب کے متعلق فعل۔ جب کوئی لفظ مذکر یا مونث اس کے ساتھ نہ ہو تو اس انفرادی صورت میں یائے مجہول سے مستعمل ہوگا جیسے دیکھئے اب کے کیا ہوتا ہے۔ مگر بعض اہل لکھنو اور خصوصاً بیرونجات میں جو لوگ زبان لکھنو کا اتباع کرتے ہیں وہ اب کی بولتے ہیں۔ ؎

سوزن مژگاں سے لے تار اشک سے بن ترے آنکھوں کو میری سی دیا
وا ہوا جب چڑھ چکا دل اے نسیم اب کی بازی گر بچی اب کی دیا (نسیم لکھنوی)

مگر فی الحقیقت اب اس لفظ کا استعمال یائے معروف سے اہل لکھنو کے نزدیک بھی صحیح نہیں۔ رسالۂ دستور الفصحا کے مؤلف کمال لکھنوی نے اب کی کو متروک قرار دیا ہے اور منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی بھی اس لفظ کی نسبت یہی رائے رکھتے تھے جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے۔ ؎

شاخوں پہ نہیں پھول یہ تختوں پہ ہیں پریاں دیکھو نو بہار آئی نئے رنگ سے اب کے (امیر مینائی)

پھر بھی اطراف لکھنؤ میں لفظ اب بھی عام و خاص کی زبان پر بطور تکیہ کلام چڑھا ہوا ہے ٭

انترسوں۔ لکھنؤ میں پرسوں کے قبل کو نرسوں کہتے ہیں اور نرسوں کے قبل کو انترسوں مگر

دہلی میں نرسوں کی جگہ انترسوں بولتے ہیں جیسے کل۔ پرسوں۔ انترسوں۔ نرسوں ٭

اجواین۔ لکھنؤ میں اسی طرح بولا جاتا ہے۔ دہلی والے اجوان کہتے ہیں۔ ؎

دی کموئی جو ہوا پیٹ میں اغیار کے درد　　مجھ کو کمبخت نے اجوان بڑی مشکل سے

ادواین۔ پائینتی کی رسّی۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔ دہلی والے ادوان کہتے ہیں۔ ؎

غیر کے ڈر سے چھپا کر بان میں　　ڈال رکھّا ہے مجھے ادوان میں (ذبیح دہلوی)

ادھیلا۔ لکھنؤ میں پیسے کے نصف حصّے کو کہتے ہیں۔ اہل دہلی دھیلا بولتے ہیں ٭

ادھیلی۔ نصف روپیہ۔ اٹھنّی۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے دہلی والے دھیلی کہتے ہیں ٭

اگرئی۔ ایک قسم کا سیاہی مائل صندلی رنگ جو خوش نو چیز دوں ناگرموتھا۔ چھال چھبیلا وغیرہ

سے بنایا جاتا ہے۔ اور اگر کی دھونی میں بساتے ہیں۔ یہ لفظ دہلی میں رائج ہے۔ بعض

صاحبان لکھنؤ اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگرئی بروزن اجنبی غلط ہے۔ کیونکہ جب

لفظ اگرہ نہیں ہے تو پھر یائے نسبت کے ساتھ ہمزہ کہاں سے آیا وہ اس کو یوں بولتے

ہیں۔ ؎

کھلتی ہے مرے شوخ پہ ہر رنگ کی پوشاک　　اودی۔ اگری۔ چمپئی۔ گلنار۔ بسنتی (امانت لکھنوی)

یہ خیال ایک حد تک درست ہے کہ سرمئی۔ فاختئی۔ پستئی وغیرہ پر اس کا قیاس نہ کرنا چاہئے

بلکہ بسنتی۔ گلابی کی طرح اگری (بلا ہمزہ) کہنا بہتر ہے۔ مگر بعض شعرا نے اجنبی کے وزن

پر بھی باندھا ہے چنانچہ خود رند لکھنوی کا شعر موجود ہے۔ ؎

اگرئی کا ہے گماں شک ہے ملاگیری کا　　رنگ لایا ہے دوپٹا ترا میلا ہو کر

اس صورت میں یہ اعتراض کچھ وزن نہیں رکھتا کہ اگرئی بروزن اجنبی غلط ہے قطع نظر

اس کے امانت لکھنوی کے شعر میں یہ الفاظ جن اعراب سے موزون ہوا ہے وہ زبان

سے جلد اور باساق ادا نہیں ہو سکتے اس کے مقابلے میں اگرچہ بہر حال فصیح و خفیف ہے۔

التماس۔ یہ لفظ لکھنؤ میں مونث بولا جاتا ہے۔ ؎

صنم پرست بلیں یا خدا اشناس مجھے　　دعائے وصل کی رہتی ہے التماس مجھے (رشک لکھنوی)

جناب جلال لکھنوی نے بھی اپنے رسالۂ تذکیر و تانیث میں اس لفظ کو مونث ہی تسلیم کیا ہے مگر اہل دہلی مذکر کہتے ہیں۔ ؎

صبح تک شمع سر کو دھنتی ہے　　کیا پتنگے نے التماس کیا (میر تقی دہلوی)

فلک رس ہو غوغا مناجات کا　　کروں التماس اپنی حاجات کا (مومن دہلوی)

تجھ سے یہ التماس ہے میرا　　غیر کا ہے کہ پاس ہے میرا (داغ دہلوی)

اندھڑ۔ لکھنؤ میں باد تند و صرصر کو کہتے ہیں۔ دہلی میں مستعمل نہیں وہاں کے لوگ آندھی کہتے ہیں مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ لکھنؤ میں آندھی کا لفظ رائج نہیں۔

اندھیارا۔ اندھیاری۔ یہ دونوں لفظ لکھنؤ سے ایجاد ہوئے اور وہاں کے شعرائے متقدمین کے کلام میں بکثرت مستعمل ہیں۔ ؎

یاد کاکل میں مجھے مشغلۂ زاری ہے　　بوندیاں پڑتی ہیں برسات کی اندھیاری ہے (امانت لکھنوی)

روشن اندھیر رخ و زلف کا تم پر کیا ہو　　نہ دیا دیکھنے اندھیار اُجالے تم نے (نسیم لکھنوی)

مگر اب غیر فصیح سمجھ کر متاخرین لکھنؤ نے اس کا استعمال چھوڑ دیا ہے۔ ؎

کیا خوف جو برسات کی راتیں ہیں اندھیری　　داغوں سے چراغاں ہے چمن میں پر طاؤس (امیر مینائی)

تاہم بعض اہل لکھنؤ اور زبان لکھنؤ کے مقلدین اب بھی لکھ جاتے ہیں جیسا کہ جناب مضطر خیرآبادی نے داغ مرحوم کے قطعہ وفات میں یہ مصرع لکھا ہے۔ ع

دن ہے کالا نور رات اندھیاری

اوٹ پٹانگ۔ بے محل۔ ناموزون۔ بیہودہ۔ واہیات۔ اہل لکھنؤ ناٹے ہندی سے بولتے ہیں اہل دہلی اوت بٹانگ کہتے ہیں۔ ؎

ہیں نے کیا اس غزل کو سہل کیا　　قافئے ہی تھے اس کے اوٹ پٹانگ (میر تقی دہلوی)

اوک۔ ایک یا دونوں ہاتھ منہ سے لگا کر پانی پینے کا ڈھنگ۔ منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی نے اپنی مشہور کتاب امیر اللغات میں تحریر فرمایا ہے کہ یہ لفظ لکھنؤ میں نہیں بولا جاتا دہلی میں رائج ہے خیر یہاں تک تو کچھ مضائقہ نہ تھا مگر انہوں نے یہ لکھ کر تحقیق لغت کا خاتمہ کر دیا کہ یہ لفظ دہلی میں مذکر بولا جاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ منشی صاحب کی یہ دونوں باتیں کس حد تک صحیح ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ لفظ اوک دہلی میں عام طور سے مستعمل ہے۔ شاید لکھنؤ میں اجنبی سمجھا جاتا ہو مگر بعض شعرائے لکھنؤ کے کلام میں اس کا وجود پایا جاتا ہے چنانچہ رند لکھنوی نے ایک شعر میں لکھا ہے:

رندانِ مے آشام نہیں جام کے پابند　　ہم اوک سے پیتے ہیں جو ساغر نہیں ملتا

جب یہ لفظ ایک لکھنوی شاعر کے کلام میں بھی موجود ہے تو منشی صاحب کا یہ فرمانا کہ یہ لفظ دہلی ہی کے لئے مخصوص ہے صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔ ممکن ہے کہ لکھنؤ میں پہلے مستعمل ہو اور متاخرین نے ترک کر دیا ہو۔ مگر یہ بات منشی صاحب نے اپنی کتاب میں نہیں لکھی۔ باقی ہم یہ بات بھی ظاہر کئے دیتے ہیں کہ لکھنؤ کے اور کسی لغت یا شاعر کے کلام میں یہ لفظ ہماری نظر سے نہیں گزرا شاید اسی بنیاد پر منشی صاحب نے اس کو دہلوی قرار دیا ہے۔

اس کی تذکیر و تانیث کے متعلق شعرائے دہلی میں سے مرزا غالب اور فصیح الملک داغ کے دو شعر ہمیں یاد ہیں۔

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے　　پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے (غالب)

مگر اس شعر سے تذکیر و تانیث کا حال نہیں کھلتا۔ البتہ داغ مرحوم کے شعر سے اس کی تانیث ثابت ہوتی ہے اور یہی درست ہے۔

مے کے دینے میں جو صرفہ ہے پلا دے پانی　　دیکھ خالی نہ رہے اوک ہماری ساقی (داغ)

صاحب فرہنگ آصفیہ نے بھی اس کو مونث ہی لکھا ہے معلوم نہیں منشی صاحب نے مذکر کیونکر لکھ دیا ۔

ایسے ۔ حرف تشبیہ جیسے تم ایسے ہزاروں پھرتے ہیں ۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے اہل دہلی تم جیسے کہتے ہیں ۔

حرف ب

باٹ ۔ تولنے کے اوزار جو لوہے یا پتھر کے ہوتے ہیں اہل لکھنؤ نون غنہ کے ساتھ بولتے ہیں ۔ اہل دہلی بٹ یا باٹ کہتے ہیں ۔

بانٹا ۔ حصہ ۔ تقسیم ۔ لکھنؤ کا لفظ ہے ۔ دہلی والے بانٹ کہتے ہیں ۔ ؎

غیر کی قسمت سے ہوں میں کم نصیب   بانٹ کیسی تھی یہ کتنی تقسیم کیا (داغ دہلوی)

باد بہنا ۔ لکھنؤ میں ہوا چلنے کو بھی کہتے ہیں ۔ دہلی میں نہیں بولا جاتا ۔

بائب ۔ بروزن نائب عالم کی چاروں طرفوں کے چاروں گوشوں میں سے ایک گوشے کا نام ہے اور تیر وغیرہ کے نشانے پر نہ پہنچنے اور کسی کے کسی مقام سے پہلو تہی کرنے اور بات کے کارگر نہ ہونے یا کسی چیز کے کسی چیز سے علیحدہ ہونے کو بھی کہتے ہیں ۔ ؎

دل سے ہم نے راہ پائی کعبۂ مقصود کی   راستے اس کے سوا جتنے تھے بائب ہو گئے (رشک لکھنوی)

لکھنؤ میں مستعمل ہے دہلی میں نہیں بولا جاتا ۔

بٹیّی ۔ ایک چھوٹا سا مشہور جنگلی پرند جس کو اہل لکھنؤ بٹی اور اہل دہلی بٹیر کہتے ہیں ۔

برّرنا ۔ تختے یا چوب وغیرہ کا خشک ہو جانے یا کسی بوجھ کے نیچے آ جانے کے سبب سے کجی پیدا کرنا ۔ ؎

دبا ہوا جو ہے ہم کو تو یہ بھی ظلم کرتے ہیں   ہماری قبر کے تختے بھی اب ہم سے برّرتے ہیں (اسیر لکھنوی)

یہ لغت لکھنؤ میں مستعمل ہے اہل دہلی برّرنا کی جگہ اینٹھنا بولتے ہیں ۔ ؎

بل انہوں نے بھی بعد مرگ بھرا   مبر ہے مرقد کے تختے اینٹھ گئے (داغ دہلوی)

بُرسی۔ لکھنؤ میں انگشتی کو کہتے ہیں دہلی میں نہیں بولا جاتا ٭

بُرد۔ لکھنؤ میں پتھر کو کہتے ہیں۔ دہلی میں رائج نہیں ٭

بِروا۔ لڑکا چھوکرا معصوم۔ اہل لکھنؤ اس لفظ کو انہیں معنی میں بولتے ہیں مگر اہل دہلی اس سے پودا۔ درخت۔ پیڑ مراد لیتے ہیں۔ جیسے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ٭

بڑمٹھا۔ لکھنؤ میں وصوبی کو کہتے ہیں دہلی میں نہیں بولا جاتا ٭

بسیرا اولنا۔ درختوں پر مرغان خوش نوا کے بولنے کو کہتے ہیں یہ لغت جناب جلال لکھنوی کی کتاب سرمایۂ زبان اردو سے لیا گیا ہے دہلی میں رائج نہیں ٭

بَل۔ اصطلاح میں اس کے کئی معنی لئے جاتے ہیں اول زور و طاقت۔ ؎

ہر موج بحر عشق کو یہ بل ہے بل بے زور   کہتی ہے دست و پائے شناور کو توڑ دوں (ذوق دہلوی)

دوم کبر و نخوت و غرور۔ ؎

کیوں نہ پلکیں ہوں جفا کار جو آفت ہوں بھویں   بل ہے تیروں کو کمانوں کو توانائی کا (ہجر لکھنوی)

سوم فدیہ اور صدقہ وغیرہ۔ ؎

زلف پیچاں کا ہے جو سودائی   دل و جان جگر وہ بل دے گا (رشک لکھنوی)

چہارم کسی چیز کی قیمت کا فرق۔ ؎

حشر میں سینہ گیسو نہیں چھٹنے والے   جو حساب ان کے نکالے تو بڑا بل ہوگا (رشک لکھنوی)

پنجم تابع فعل۔ ذریعہ۔ وسیلہ۔ سہارا۔ اس بل میں کتابت کا تھوڑا سا فرق ہے اہل لکھنؤ اس کو بھل کہتے ہیں۔ ؎

بانکی ادا سے قتل انھوں نے کیا ہمیں   مہندی لگا کے پاؤں میں پنجوں کے بھل چلے (آتش لکھنوی)

سجھے کوچے کو ترے کعبہ یہاں عاشق   سجدے کرتے ہوئے پیشانیوں کے بھل آئے (جلال لکھنوی)

تیر سے تیر پڑے دل پہ نگاہیں جو لڑیں   نیم جاں پاؤں پہ اس کے میں گرا سر کے بھل (امیر مینائی)

مگر اہل دہلی اس کو بھی بل ہی کہتے ہیں۔ ؎

ہے قطعۂ رہِ عشق میں اے ذوق ادب شرط　　جوں شمع نواب سر ہی کے بل جائے تو اچھا (ذوق دہلوی)

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل　　میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا (مومن دہلوی)

چلتے ہو نخوت سے تم پنجوں کے بل　　یہ تو پوری طرز پامالی نہیں (داغ دہلوی)

ایک صاحب نے بھل اور بل کے متعلق ہم سے یہ کہا تھا کہ اہل لکھنؤ نے ہائے مخلوط بڑھا کر اس کے مفہوم میں امتیاز کر دیا ہے مگر یہاں تو بہت سے بل ہیں ان میں بھی ضرور فرق کرنا چاہئے تھا۔ چونکہ بل اور بھل کا تفاوت بول چال سے بخوبی ظاہر ہو سکتا ہے لہٰذا ہم اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے جن کتابوں سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں وہاں اسی طرح لکھے ہوئے تھے ؎

بُلّا۔ حباب پانی کا بُلبلا۔ جناب جلال لکھنوی نے اپنے لغت میں بُلبلے کا لفظ نہیں لکھا اور بُلّے کو بلبلے پر ترجیح دی ہے یعنی بُلّا کتاب میں تحریر کیا ہے مگر کسی اہل لکھنؤ کی تحریر میں بلّا ہماری نظر سے نہیں گزرا سب نے بلبلا لکھا ہے۔ ؎

گنبدِ مدفن مرے اشکوں میں یوں ہے بعد مرگ　　بلبلے پڑتے نظر آتے ہیں جیسے آب پر (ناسخ لکھنوی)

زیست کا اعتبار کیا ہے امیر　　آدمی بلبلا ہے پانی کا (امیر مینائی)

خواجہ اشرف علی لکھنوی نے کتاب مصطلحات اردو میں بلبلے کا لغت تو قایم کیا ہے مگر انہوں نے بھی اس کے معنے پانی کا بلّا تحریر کئے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل لکھنؤ معمولی بول چال میں بلبلے کو بُلّا ہی کہتے ہیں اور تحریری زبان بلبلا ہے۔ دہلی میں بُلّا کوئی نہیں کہتا ؎

بلچک۔ ضرب شمشیر کو کہتے ہیں اہل لکھنؤ بولتے ہیں دلّی میں مستعمل نہیں۔ ؎

ابرو کی یہ جنبش ہے کہ تلوار کی بلچک　　پتلی کی یہ گردش ہے کہ اوجھڑ ہے سپر کی (سحر لکھنوی)

بوچھار۔ اہل لکھنؤ اس لفظ کو رائے مہملہ سے بولتے اور لکھتے ہیں۔ ؎

قتل ثابت ہو گیا لیکن اسے رہنے دیجئے   تر ہے دامن خون سے انکار رہنے دیجئے
حرف ہونٹوں کی نزاکت میں نہ آجائے کہیں   گالیوں کی ہر گھڑی بوچھار رہنے دیجئے } شمشاد لکھنوی

جناب جلال لکھنوی نے بھی اپنے رسالہ تذکیر و تانیث میں اس لفظ کو ان الفاظ میں شامل کر کے لکھا ہے جن کے آخر میں رائے مہملہ ہے اہل دہلی رائے ثقیلہ سے بولتے ہیں ؎

ٹھیر و دم لو چاہئے اسوقت میں کچھ آڑ بھی   تیز چلتی ہے ہوا بھی مینہ کی ہے بوچھاڑ بھی (داغ دہلوی)

ایک سے ربط ایک سے ہے بگاڑ   روز ہے واں یہی اکھاڑ پچھاڑ
اس کا چھایا ہوا ہے ابر ستم   کیوں نہ تیروں کی مجھ پہ ہو بوچھاڑ } مجروح دہلوی

بوگرا نکالنا۔ لاٹھیوں کی مار سے سست و مضمحل کر دینا لکھنؤ میں مستعمل ہے ؛

بونڈلا۔ لکھنؤ میں بگولے کو بھی کہتے ہیں ؛

بھڑل۔ لکھنؤ میں بے حیا اور مسخرے کو کہتے ہیں دلّی میں رائج نہیں ؛

بھساکو وہ تمباکو جو کڑوا نہ ہو ہلکا تمباکو یہ بھی لکھنؤ میں بولا جاتا ہے ؛

بھگت بنانا۔ ایسی وضع بنانا جس پر لوگ ہنسیں۔ لکھنؤ میں رائج ہے ؛

بھینسا۔ بھینس کا مذکر لکھنؤ میں بولا جاتا ہے دہلی والے جھوٹا بھی کہہ دیتے ہیں لکھنؤ میں جھوٹا کوئی نہیں کہتا ؛

بھوسا۔ اہل لکھنؤ بولتے ہیں اہل دہلی بھس کہتے ہیں ؛

بیٹھکا۔ لکھنؤ میں نشست گاہ کو کہتے ہیں۔ اہل دہلی نہیں بولتے ؎

خبردار اے مسافر خوف کی جا راہ ہستی ہے   ٹھگوں کا بیٹھکا ہے جا بجا چوروں کی بستی ہے (امیر مینائی)

بیدھنا۔ (یائے مجہول سے) موتی وغیرہ میں سوراخ کرنے کو کہتے ہیں لکھنؤ میں بولا جاتا ہے ؎

جبین غربت میں سوا زخم جگر کے معلوم   خوب بیدھا گیا جب بحر سے نکلا گوہر (تسلیم لکھنوی)

منشی امیر اللہ صاحب تسلیم لکھنوی کے دیوان میں اس کی کتابت اسی طرح ہے۔
اہل دہلی یائے معروف اور نون غنہ سے بولتے ہیں۔ ؎

مسلسل اشک ہیں پلکوں پہ دیکھو　　یہ موتی سوزن مژگاں نے بیندھے (داغ دہلوی)

بیہٹر۔ یہ لفظ دہلی میں مستعمل نہیں لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔ ؎

بلند و پست عالم کا بیاں تحریر کرتا ہے　　قلم ہے شاعروں کا یا کوئی رہرو ہے بیہٹر کا (آتش لکھنوی)

حرف پ

پاری۔ گڑ کی ایک مقدار کو کہتے ہیں کہ مدور اور منجمد کر کے لاتے ہیں اور بازار میں بیچتے ہیں (ازسرمایہ زبان اردو مولفہ جناب جلال لکھنوی) یہ لفظ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے اہل دہلی پاری کی جگہ بھیلی بولتے ہیں۔ ؎

واسطے افطار کے اے شیخ شربت چاہیئے　　قند کے کوزے کے بدلے گڑ کی بھیلی ہی سہی (داغ دہلوی)

پان پتا۔ اہل لکھنؤ پان اور مختلف لوازم خانہ داری کے موقع پہ بولتے ہیں۔

پاؤں۔ اس لفظ کی طرز تحریر میں تھوڑا سا فرق ہے شعرائے لکھنؤ اس کے آخر میں نون لکھتے ہیں اور نون کی ردیف میں لاتے ہیں۔ مگر اہل دہلی آخر میں واو لکھتے ہیں اور واو کی ردیف میں لاتے ہیں۔ ؎

نافہم لوگ بیٹھے ہیں بن بن کے خار بحر　　محفل سے اٹھے جاتے ہیں اہل سخن کے پاؤں (بحر لکھنوی)
غالب مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو　　پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پانو (غالب دہلوی)

شعرائے دہلی و لکھنؤ کے دواوین میں یہ التزام برابر دکھائی دے گا۔ مگر بیرونجات میں پانوں کی کتابت عموماً اہل لکھنؤ کے موافق ہوتی ہے یعنی سب لوگ پاؤں لکھتے ہیں۔

پتا آنا۔ کنایہ ہے کسی کے ہوش باختہ اور دنگ ہونے سے لکھنؤ میں بولا جاتا ہے دہلی میں نہیں سنا گیا۔ ؎

صنوبر سے جو کرتا قد کشی تو | نہ کٹ جاتا تو پیتا یا تو ہوتا (آتش لکھنوی)

کہ دو کہ نہ باتوں میں مری شاخ نکالے | کہ دوں کا پتے کی ہیں تو پتا بتا دے گا ناصح (امیر مینائی)

پرے۔ ورے۔ پرے سے یہ الفاظ دہلی میں بولے جاتے ہیں۔ لکھنؤ میں مستعمل نہیں۔ ؎

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب | لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے (غالب دہلوی)

چل پرے ہٹ مجھے نہ دکھلا منہ | اے شب ہجر تیرا کالا منہ (مومن دہلوی)

بسمل ترے تڑپ کے کبھی پہنچے نہ پاؤں تک | یا دو قدم ورے رہے یا دو قدم پرے (ذوق دہلوی)

بزم سے مجھ کو وہ کرتے ہیں یہ کہہ کر باہر | ہٹ پرے دور ہو چل دفع ہو باہر باہر (راسخ دہلوی)

پڑاقا۔ ایک قسم کی آتش بازی جس میں سے چھوٹنے کے وقت آواز نکلتی ہے۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔ دہلی والے پڑاقا نہیں کہتے بلکہ پٹاخا بولتے ہیں۔ ؎

غنچے چٹک رہے ہیں پٹاخوں کی طرح سے | شادی ہے کیا چمن میں عروس بہار کی (داغ دہلوی)

پنواڑی۔ پھلواری وغیرہ کے قیاس پر اہل لکھنؤ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پان کے درخت ہوتے ہیں مگر اہل دہلی پان بیچنے والے یعنی تنبولی کو بھی پنواڑی کہہ دیتے ہیں ❊

پھریرانا۔ لکھنؤ میں جست کرنے کو کہتے ہیں۔ دہلی میں جھنڈے کے پھریرے کا ہلنا۔ لہرانا مراد لی جاتی ہے ❊

پھلیندا۔ لکھنؤ میں بڑی جامن کو کہتے ہیں ❊

پھول وہی جو مہیسر چڑھے۔ پسندیدہ عابد۔ لکھنؤ کا محاورہ ہے۔ ؎

کب شعر ہم نے یار کے آگے پڑھے نہیں | کس دن ہمارے پھول مہیسر چڑھے نہیں (بحر لکھنوی)

اہل دہلی "پھول وہی جو مہیش چڑھے" بولتے ہیں اور یہ دلیل لاتے ہیں کہ اصل میں مہیش اور مہیشور مہادیو جی کا لقب ہے ❊

پیٹ (بیائے معروف) مگر جناب جلال لکھنوی اس کے آخر میں ہائے مخلوط کو غیر فصیح و مکروہ سمجھتے ہیں اور انہوں نے اپنے دیوان میں بھی پیٹ ہی لکھا ہے۔ ؎

قبر میں پیٹھ ہماری نہ لگے گی ہرگز ۔۔۔ یار نے آکے جنازے کو جو کاندھا نہ دیا (جلال لکھنوی)

پیٹھ بستر سے لگانے نہیں دیتی شب بھر ۔۔۔ کسی محبوب کی پشت و کمر و دوش کی یاد (؍ ؍)

دلی میں کوئی شخص پیٹھ نہیں کہتا۔ وہاں سب پیٹھ بولتے ہیں۔ ؎

عدو کو بھی عدو میں پیٹھ پیچھے کہہ نہیں سکتا ۔۔۔ وہ فرماتے ہیں توبہ کر کہ یہ غیبت میں داخل ہے (داغ دہلوی)

حرف ت

تانسنا۔ چشم نمائی۔ ڈرانا۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔ دلی میں مستعمل نہیں +

تکلی لگانا۔ بغور کسی کی طرف دیکھنا۔ گھورنا۔ یہ بھی لکھنؤ میں بولا جاتا ہے +

تھالا۔ درخت کا تھانولا۔ لکھنؤ میں رائج ہے۔ ؎

کس گلستاں کی چمن بندی ہے اے مردم چشم ۔۔۔ نخل مژگاں کے بھرے اشکوں سے تھالے تم نے (نسیم لکھنوی)

اس کے ابرو کا پڑا جس نخل کے تھالے میں عکس ۔۔۔ پھل لگا جو شاخ میں تلوار کا پھل ہو گیا (امانت لکھنوی)

شعرائے دہلی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا وہ اس کے عوض تھانولا کہتے ہیں +

تئیں۔ علامت مفعول۔ پہلے دلی کے شعرا استعمال کرتے تھے۔ اب وہاں کے لوگ نثر میں لکھ جاتے ہیں نظم میں کوئی نہیں لکھتا۔ اس کے متعلق ایک عجیب لطیفہ مشہور ہے۔ سنا ہے مرزا غالب دہلوی ایک دفعہ لکھنؤ گئے تھے کسی شخص نے طنزاً ان سے پوچھا کہ اہل لکھنؤ "کو" بولتے ہیں اور اہل دہلی "تئیں"۔ آپ کے نزدیک ان میں سے کون سا لفظ فصیح ہے؟ مرزا صاحب نے فرمایا کہ فصیح تو یہی ہے جو اہل لکھنؤ بولتے ہیں مگر اس میں یہ قباحت ہے کہ اپنا عجز و انکسار ظاہر کرنے کے لئے اگر میں یہ کہوں کہ "میں آپ کو کتے سے بدتر سمجھتا ہوں"، تو ظاہر ہے کہ آپ کو کا لفظ میں اپنی نسبت استعمال کروں گا مگر اندیشہ ہے کہ کہیں آپ اپنی نسبت سمجھ کر برا نہ مان جائیں کہ ہم کو کتے سے بدتر بناتا ہے +

گو اب تئیں کا رواج بہت کم ہو گیا ہے مگر پھر بھی بعض موقعوں پر اس سے کام

لینے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

تلوار کا پیٹھا۔ کنایہ ہے تلوار کی چوڑی باڑھ سے ۔

ازل سے قاتلوں کو نقش خوبی سے بھری کسی تلوار کے پیٹھے پہ آ تو ہو نہیں سکتا (بحر لکھنوی)

لکھنؤ میں مستعمل ہے دلّی میں نہیں سنا گیا۔

حرف ج

جھنجے پڑ جانا۔ مہین و باریک کپڑے کا سمٹ کر جا بجا اکٹھا ہو جانا ۔

رات بھر تڑپے خیال یار میں ہم اس قدر پڑ گئے جھنجے ہزاروں چادر مہتاب پر (ناسخ لکھنوی)

کیا پیشوا زمیں کوئی بحر کرم لگائے جھنجے پڑے ہیں موج کے دریا پاٹ میں (امانت لکھنوی)

دوسرے معنی کسر شان اور بے آبرو ہونے کے ہیں ۔

اس ستمگر کے دوپٹے کی چپاوٹ دیکھ کر پڑ گئے جھنجے گلوں کے جامۂ توقیر میں (بحر لکھنوی)

اہل دہلی صرف جھنجے پڑنا نہیں بلکہ شان میں جھنجے پڑنا بولتے ہیں ۔

یاں تک آتے ہوئے ہو جائیگا اک آن میں کیا جھنجے پڑ جائینگے کچھ آپ کی اب شان میں کیا (نصیر دہلوی)

جگت۔ رنگ۔ لطیفہ گو۔ بذلہ سنج۔ ضلع باز۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔ اہل دہلی جگت باز بولتے ہیں۔

جگنی۔ عورتوں کے گلے کا اک زیور۔ جناب جلال اپنی کتاب سرمایہ زبان اردو کے صفحہ ۱۳۴ پر لکھتے ہیں کہ "یہ بعضے زیور مذکور۔ یعنی جگنی کو جگنو بولا و معروف بولتے ہیں لیکن فقیر کو اس کی صحت میں کلام ہے۔ البتہ جگنو کرمک شب تاب کے معنوں پر صحیح ہے۔" جناب جلال کے ایسا لکھنے کی غالباً یہ وجہ ہے کہ اہل دہلی جگنی اور جگنو دونوں طرح بولتے ہیں۔ انہوں نے جگنو کو اہل دہلی کے سر منڈھنا چاہا اور جگنی کو لکھنؤ کے لئے مخصوص کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکے کیونکہ لکھنؤ کے شعرائے متقدمین و متاخرین جگنی اور جگنو

دونوں طرح باندھتے چلے آئے ہیں ؎

تیرے زیور کے نگیں رات کو ایسے چمکے　　ایک جگنی سے ہوئے سیکڑوں جگنو پیدا (بحر لکھنوی)

جان پڑ جاتی ہے زیور میں پہننے سے ترے　　اڑ نہ جائے کہیں جگنی تری جگنو ہو کر (وزیر لکھنوی)

سر کا دوپٹہ شب کو جو گردن کے پاس تھے　　جگنو کی طرح یار کا جگنو چمک گیا (رند لکھنوی)

کبھی آیا نہ چمکتا ہوا آنکھوں کو نظر　　بخت کا میرے ستارا ہے کہ جگنو تیرا (ماہر لکھنوی)

اٹھالوں میں آنکھوں کا تارا سمجھ کر　　اتارے جو وہ ماہ جگنو گلے سے (خورشید لکھنوی)

جلے تن - وہ شخص جو کسی بات کا متحمل نہ ہو سکے - نہایت غصہ والا - لکھنؤ کا محاورہ ہے - ؎

آہ ہے برق ہے خرمنِ ہستی رقیب　　پھر نہ کہئے گا کہ تو بھی ہے جلے تن کیا (صبا لکھنوی)

جوجو - ایک فرضی نام جس سے بچوں کو ڈراتے ہیں لکھنؤ میں مستعمل ہے - دہلی میں - بی شادی بیچا وغیرہ اور اَور کئی لفظ ہیں *

چھپ چھالیا - دغاباز اور جعل ساز لکھنؤ میں بولا جاتا ہے *

چھالنا - پانی یا شراب وغیرہ کو برف یا شورے میں رگا کر ٹھنڈا کرنا لکھنؤ میں بولا جاتا ہے - ؎

ساقی مزا ہے گرمیوں میں آبِ سرد کا　　بوتل شرابِ ناب کی شورے میں چھال دے (بحر لکھنوی)

اہل دہلی اس لفظ کو برتن جوڑنے اور ٹانکا لگانے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں *

حرف چ

چاند سورج - ایک طلائی یا نقرئی زیور کا نام جو مہر و ماہ کی صورت پر بنا ہوا عورتوں کی چوٹی میں لٹکا رہتا ہے - اہل لکھنؤ کا ایجاد ہے - ؎

بنیں گے کس کا زیور چاند سورج　　گھڑا کرتے ہیں زرگر چاند سورج (آتش لکھنوی)

چاہئے - اس لفظ کے متعلق اڈیٹر صاحب فصیح الملک نے اپنے اپریل سنہ ۱۹۰۶ء کے

رسالے میں مندرجہ ذیل مضمون لکھا ہے:-

قواعد زبان کے باضابطہ اور مکمل ومدوّن نہ ہونے سے جو جو دقتیں پیش آتی ہیں ان کے لئے بجز تدوین قواعد کوئی علاج سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ کہاں تک کیا جائے کہ لفظ لفظ کی تحقیق ایک جداگانہ اہتمام سے کی جائے۔ مستثنیات، اور اختلافات قواعد ہر زبان میں ہوتے ہیں۔ مگر اردو کی حالت سب سے نرالی ہے۔ قدم قدم پر الجھاؤ۔ جگہ جگہ اڑنگاڑ موجود ہے۔ دیکھئے اس منتشر اور غیر محدود زبان کی قسمت کب جاگے اور اہل ادب قواعد کی ترتیب پر کب مستعد ہوں ۔

یہ لفظ جو عنوان میں لکھا گیا ہے روزمرّہ کی بول چال کا معمولی لفظ ہے۔ اور اس کا استعمال حسب ذیل معنوں میں پایا جاتا ہے:-

(۱) چاہنا سے صیغۂ امر بمعنی محبت کرنا۔

(۲) بمعنی مناسب۔ موزوں یعنی ایسا ہی چاہئے۔

(۳) بمعنی درکار ہے۔ مطلوب ہے۔ ضروری اور لازم ہے۔ مثلاً وہ چیز چاہئے۔

نمبر (۱) بحیثیت فعل اپنی تمام گردان کے ساتھ مستعمل ہے۔ اور اسمیں مفرد وجمع ماضی ومضارع امر ونہی غرض کل صرفی تغیرات ہوتے ہیں۔ مثلاً چاہنا۔ چاہ۔ چاہتا۔ چاہا۔ چاہے۔ چاہئے وغیرہ۔ نیز یہ مصدر اور اس کے بعض مشتقات بلحاظ تذکیر وتانیث بمنزلہ اسم فعل ہیں۔ اس میں امر کا صیغہ واحد چاہ اور جمع کے لئے چاہئے ہے۔ مگر چاہئے اکثر تعظیم کے موقع پر آپ کے ساتھ من حیث المفہوم واحد ہے ۔

نمبر (۲) کا چاہئے اس مصدر سے متعلق معلوم نہیں ہوتا۔ اس میں اتنے صرفی تغیرات نظر نہیں آتے۔ البتہ وہ دوسرے افعال کے ساتھ بلا تغیر مستعمل ہے۔ جیسے ہونا چاہیے۔ کرنا چاہئے۔ بلانا چاہئے۔ کھانا چاہئے وغیرہ۔ یہاں تک

جو باتیں بیان کی گئی ہیں۔ وہ سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔ مگر نمبر ۳ کے چاہیئے
میں بعض بزرگوں کا اختلاف نظر آتا ہے۔ اور وہ اختلاف بھی معنوی نہیں ہے
بلکہ تلفظی و مکتوبی۔ نمبر ۳ کا چاہیئے بجائے افعال کے اسماء کا تابع پایا جاتا ہے۔
مثلاً کتاب چاہیئے۔ مکان چاہیئے *

اس میں قدیم الایّام سے صرف ایک تغیّر لفظی دیکھا جاتا ہے۔ یعنی جب
اسم جمع ہوتا ہے تو "چاہیئے" کی جگہ "چاہیئں" لکھتے اور بولتے ہیں۔ جیسے اتنی کتابیں
چاہیں سب کے مکان ڈھونڈنے چاہیئں وغیرہ *

قریب قریب تمام مصنفین اور ہندوستانی اردو اخبار اسی تلفظ و کتابت
کے پابند ہیں۔ مگر بعض اہل لکھنؤ اور مخصوص ریاض الاخبار میں یہ مطابقت
نہیں دیکھی جاتی۔ وہ واحد اور جمع دونو حالتوں میں صرف "چاہیئے" بغیر نون
کے لکھتے ہیں۔ مثلاً دس کتابیں چاہیئے۔ اس طرح میں غزلیں آنا چاہیئے۔ دو گواہ
چاہیئے۔ چنانچہ ۱۴۔ فروری ۱۹۰۶ء کے فتنے میں جناب بیان ویزدانی کی ایک
رباعی اس طرح چھپی ہے :-

سب کچھ ہے اسی نور الٰہی کے لئے۔	اور وہ دو جہاں کی بادشاہی کے لئے
ٹکڑے وہم اعجاز کیا ماہِ منیر	یعنی دو چاہیئے گواہی کے لئے *

ممکن ہے کہ جناب بیان ویزدانی مرحوم نے بھی اسی طرح لکھا ہو۔ سُنا گیا ہے
کہ حضرت امیر مینائی مغفور بھی اسی کے قائل تھے اور یہی وجہ ہے کہ اس لفظ کی
تحقیق اس اہتمام سے کیجاتی ہے کیونکہ اگر یہ صحیح ہے۔ تو حضرت منشی صاحب رح کوئی
معمولی محقق نہ تھے۔ کسی نہ کسی قوی استدلال سے یہ اجتہاد فرمایا ہوگا۔ عرصہ ہوا۔
کہ میں نے کسی صاحب سے اس کی بابت دریافت کیا تھا۔ جس کا جواب انہوں نے یہ دیا
کہ "چاہیئے" میں کیجئے۔ لیجئے کی طرح خود علامت جمع موجود ہے۔ پھر جمع الجمع بنانے

کی کیا ضرورت ہے۔ اگر واقعی یہ خیال اور استدلال صحیح ہے تو حیرت ہے۔ کیونکہ "چاہئے" میں جمع وحدت یا تعظیم کا لحاظ صرف صیغہ امر کے لئے دیکھا جاتا ہے۔ اور کیجئے۔ لیجئے کی مطابقت اسی میں پائی جاتی ہے۔ چاہئے۔ نمبر ۳ بمعنی درکار ومناسب میں یہ استعمال کب ہے۔ جس طرح کہ آپ۔ اُن اور تُم کے ساتھ چاہئے بولتے ہیں۔ اسی طرح اُس۔ مجھ۔ تجھ۔ وہ۔ یہ کے ساتھ بھی ؛ جیسے آپ کو چاہئے۔ اُن کو چاہئے تُم کو چاہئے۔ اُس کو چاہئے وغیرہ اگر یہ (ی) علامت جمع ہے تو اُس۔ مجھ وغیرہ ضمیر واحد کے ساتھ یہ اجتماع کیسا؟ اور اگر کتابیں چاہئیں" یہ ترکیب غلط ہے تو اَور سیکڑوں الفاظ کی جمع (ی۔ ں) سے کیوں جائز ہے؟ مثلاً چار کتابیں پائیں۔ لائیں وغیرہ۔ میرے خیال میں یہ جمع صرف اس چاہئے میں جو چاہنا سے صیغہ امر ہے۔ نہیں بن سکتی۔ ورنہ ان دونوں مذکورہ بالا نمبروں میں بغیر کسی وجہ موجّہ کے یہ استدلال ٹھیک نہیں۔ یہ استفسار عموماً ہر زبان داں اور اہل زبان اور خصوصاً مکرمی حضرت ریاضؔ وجناب جلیلؔ اور جناب برہمؔ سے کیا جاتا ہے۔ کہ یہ مخصوص حضرات اپنے استاد مغفور کے فیضان صحبت سے زیادہ مستفیض ہوئے ہیں" ؛

اس مضمون پر حکیم برہمؔ صاحب نے ۲۴۔ اپریل سنہ ۱۹۰۶ء کے ریاض الاخبار میں حسب ذیل نوٹ تحریر فرمایا :۔

فصیح الملک مارہرہ میں ایک سوال کیا گیا ہے کہ ریاض الاخبار "غزلیں آنا چاہئے" لکھتا ہے۔ حالانکہ "آنا چاہئیں" ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ اخبارات کا عمل درآمد یہی ہے۔ اور ایک بڑا حصہ ملک کا عامل ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ منشی امیر احمد صاحب مرحوم بھی اسی کے عامل تھے۔ منشی صاحب کا عملدرآمد جب معلوم تھا۔ تو سوال ہی بے سود ہے۔ منشی صاحب مرحوم بیشک اس کے عامل تھے۔ اور ہم لوگ بھی جو زبان لکھنؤ کی تتبع کرتے ہیں۔ اسی کے عامل ہیں۔ اور ہمارے لکھنؤ میں ثقات کا

اسی پر عمل ہے۔ دہلی کے متعلق ہم کو خاص تحقیقات کا موقع نہیں ملا۔ ہاں اتنا جانتے ہیں۔ کہ ذوق۔ غالب۔ مومن کے کلام میں ہم نے کہیں ایسا عملدرآمد نہیں دیکھا نہ جناب داغ کی بول چال میں داخل۔ ممکن ہے اصحاب دہلی اس کے عامل ہوں۔ اس حالت میں یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہو جائے گا۔ ہم لوگ لکھتے ہیں۔ "اُن کے معلومات وسیع ہیں۔ اُن کی عنایات کا شکریہ ادا ہونا مشکل ہے"۔ اس کے خلاف احاطہ پنجاب میں ان کی معلومات اُن کی عنایات بولتے ہیں۔ صدہا الفاظ ایسے ہیں جن میں اختلاف ہے۔ زبان کو کسی قاعدے کا پابند کرنا دشوار ہے۔ جب کوئی قاعدہ ترتیب دیا جائے گا تو اس کو ان باتوں پر لحاظ کرنے کا موقع ملیگا۔ ہم چاہتے ہیں۔ کہ جناب احسن صاحب ایسی چھوٹی باتوں پر وقت نہ صرف فرمایا کریں۔ جناب جلیل کو اگر فرصت ہو۔ تو وہ اس بحث پر ایک بسیط نظر ڈال کر ممنون فرمائیں"۔

اس کے بعد ۱۲ مئی ۱۹۰۸ء کے ریاض الاخبار میں جناب جلیل جانشین حضرت امیر مینائی رح کی ایک چٹھی چھپی ہے۔ اور ہمارے مکرم حکیم برہم صاحب نے اس پر بھی ایک اچھا خاصا مضمون لکھ دیا۔ چونکہ حکیم صاحب کی بعض باتیں اصل بحث سے کچھ تعلق نہیں رکھتیں۔ بلکہ ایک جداگانہ جھگڑے کا آغاز کرتی ہیں۔ اس لئے ہم وہ مضمون بھی یہاں درج کرتے ہیں۔ اور اس پر اپنی ناقص رائے کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں:۔

جناب جلیل جانشین حضرت امیر رح کا خط آج کسی کالم میں ہم درج کریں گے۔ جس کے پڑھنے سے ناظرین کو معلوم ہوگا۔ کہ "چاہئے" حالت جمع میں بھی کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ جناب جلیل فرماتے ہیں۔ کہ حضرت فصیح الملک داغ مرحوم کا کلام دفتر دفتر موجود ہے۔ مگر وہ دو ایک جگہ بھی اس کے عامل نہیں پائے جاتے۔ یہ ایک ایسی دلیل ہے جس کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ اور جناب داغ ہی پر کچھ منحصر نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں ذوق۔ مومن۔ غالب کے کلام میں ایک شعر ایسا موجود نہیں ہے

جس میں ایسا تصرف کیا گیا ہو۔ متقدمین شعرا جو بالکل آزاد تھے۔ اور جن کی زبان کی پیروی اس وقت نہیں کیجاتی۔ اُن کے کلام بھی اس سے مستثنٰی ہیں۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے دیکھنا چاہیئے۔ کہ دہلی میں ثقات وخواص کی زبان پر آج کل ایسا عمل جاری ہے یا نہیں۔ اگر ثقات عامل ہیں جیسا وہ اپنی تحریروں میں عمل کرتے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اُن کی زبان کی گرفت کریں۔ چاہیے وہ کیسی ہی غیر مانوس اور غیر فصیح ہو۔ یہ ضرور ہے کہ ۳۰ سال سے اُدھر دہلی اور پنجاب میں ایسا تغیر ہوا ہے۔ اور ہمارے خیال میں اس کے پہلے عامل سرسید مرحوم ہیں۔ غالب مرحوم کی کتابیں اس وقت ہمارے سامنے نہیں ہیں۔ ممکن ہے۔ کہ ان کی تحریروں میں ایسا عمل پایا جاتا ہو۔ ہمارے نزدیک اس اختلاف کی وجہ سے یہ مسئلہ اب قابل توجہ نہیں ہے۔ ایسے بہت سے تغیر آج کل ہو رہے ہیں۔ اور بعض تو بالکل بے ضرورت معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً "ان کی قسمت میں درد دُکھ اٹھانے تھے۔ پھر وہ کیوں نہ جئیں" اس زمانے میں کام کے آدمی ذرا ملنے مشکل ہیں۔ ان تغیرات کی وجہ اگر معلوم ہوتی ہے تو یہی کہ دہلی پر جب سے پنجابیوں کا اثر ہوا۔ اور ان کی آبادی بڑھی۔ تو ایک دوسری زبان باہم میل جول کی وجہ سے پیدا ہو گئی۔ جس کا ذکر غالب مرحوم نے بھی ایک دو مقام پر فرمایا ہے۔ اردو کے قواعد لکھنے والوں کو ضرور مشکل ہے۔ کہ وہ موجودہ زمانے میں زبان کی تقلید وتنقیح میں کس کی جنبہ داری کریں اور کس کے ہدف ملامت بنیں۔ لیکن آسان تدبیر یہ ہے کہ زبان کی لطافت اور فصاحت کا خیال مدنظر رکھنا چاہیئے۔ اور یہ دیکھنا چاہیئے۔ کہ اردو زبان کی شائستگی اور تہذیب کی طرف کس نے خیال کیا ہے۔

جناب جلیل کا مضمون درج کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حکیم برہم صاحب کے اتباع زبان لکھنؤ کی حقیقت جس کے وہ بڑے زور شور سے مدعی ہیں ناظرین کے سامنے ظاہر کردی جائے۔ حکیم صاحب نے پہلے نوٹ میں ایک جگہ لکھا ہے: "ہم لوگ

بھی جو زبان لکھنؤ کی تتبع کرتے ہیں"۔ اس جملے میں لفظ تتبع مونث لکھا گیا ہے۔ حالانکہ لکھنؤ میں کوئی بھی اس کو مونث نہیں بولتا۔ ملاحظہ ہو۔ ؎

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اس مغفور کا (ناسخ لکھنوی)

جناب جلال لکھنوی بھی اپنے رسالہ تذکیر و تانیث میں اس لفظ کو مذکر ہی تحریر فرماتے ہیں۔ شاید منشی امیر احمد صاحب مونث لکھتے ہوں حکیم صاحب کے معلومات اور عنایات کا بھی یہی حال ہے "ان کے عنایات کا شکریہ ادا ہونا دشوار ہے) اس طرح اہل لکھنؤ ہرگز نہیں بولتے۔ وہاں یہ لفظ مونث اور مفرد بولا جاتا ہے۔ نہ کہ مذکر و جمع۔ اگر حکیم صاحب کو اس میں شک ہو تو وہ اساتذۂ لکھنؤ کے دیوان دیکھ کر اپنی تسلی کر سکتے ہیں۔ فی الحال ایک شعر ہم بھی لکھے دیتے ہیں ؎

جگہ ہوتی میری زمانے کے دل میں تمہاری جو مجھ پر عنایات ہوتی (شمشاد لکھنوی)

دوسرے نوٹ میں بھی حکیم صاحب نے دو فقرے لکھ کر اہل دہلی پر سخت اعتراض کیا ہے مثلاً "اسکی قسمت میں یہ درد دکھ اٹھانے تھے"۔ "اس زمانے میں کام کے آدمی ذرا ملنے مشکل ہیں"۔ ان فقروں میں حکیم صاحب کے خیال کے موافق "درد دکھ اٹھانا تھے" اور "کام کے ذرا ملنا مشکل ہیں"۔ ہونا چاہئے تھا۔ اس تغیر کی وجہ حکیم صاحب نے یہ لکھی ہے کہ دہلی پر جب سے پنجابیوں کا اثر ہوا۔ اور ان کی آبادی بڑھی، تو ایک دوسری زبان باہمی میل جول کی وجہ سے پیدا ہو گئی"۔ حکیم صاحب کا یہ فرمانا بھی واقعات کے بالکل خلاف ہے اہل پنجاب زبان دہلی کی تقلیب کرتے ہیں۔ اہل دہلی پنجابیوں کا تتبع نہیں کرتے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل امثال سے ظاہر ہے ؎

جو جو عذاب قبر میں ہونے تھے ہو چکے روز جزا نجات کی صورت ہوئی تو کیا (تسلیم لکھنوی)

یوں لیے خنجر کے بوسے متصل لینے نہ تھے زخم کاری کی ہنسی میں کام سیر ا ہو گیا۔ (مومن دہلوی)

مومن مرحوم کے وقت میں دہلی پنجابیوں کے اثر سے محفوظ تھی۔ پھر انہوں نے ایسا

استعمال کیوں کیا۔ اور جناب تسلیم نے باوجود لکھنوی ہونے کے ایسا تغیر کس طرح جائز رکھا۔ کیا اُن پر بھی پنجابیوں کا اثر پڑ گیا۔ فصحائے دہلی اسی طرح بولتے ہیں۔ اس کی مفصل بحث حرف نا میں دیکھنی چاہئے۔ اہل پنجاب پر بلا ضرورت آوازے کسنا ضرور خواہ حکیم صاحب کو اپنے گھر کی خبر نہ ہو۔

اب اصل بحث کے متعلق جناب جلیل کا مضمون درج ذیل کیا جاتا ہے۔

چاہئے کو بحالت جمع "چاہئیں" کہنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ یہ ایک غلطی ہے۔ جو اکثر اخبارات میں رائج ہو گئی ہے۔ اس غلطی کی گرفت سب سے پہلے عالیجناب وزارت مآب یمین السلطنت دام اقبالہ نے فرمائی تھی۔ دبدبہ آصفی نمبر ۱ جلد ۷ میں جناب ممدوح تحریر فرماتے ہیں کہ "بعض اصحاب چاہئے کے لفظ کو جمع کی حالت میں چاہئیں لکھتے ہیں۔ مثلاً دوائیں دینی چاہئیں۔ یہ درست نہیں ہے۔ چاہئے ہمیشہ اپنی حالت پر رہتا ہے۔ اس میں تغیر نہیں ہو سکتا۔"

میرے خیال میں چاہئے کوئی صیغہ کسی مصدر کا نہیں ہے بجائے خود ایک لفظ ہے اور مناسب و زیبا کے معنے دیتا ہے جس طرح فارسی میں باید کا لفظ ہے کہ واحد و جمع پر یکساں آتا ہے۔ اسی طرح اردو میں چاہئے ہے۔ کہ ہر حال میں علیٰ حالہا رہتا ہے۔ تمام فصحائے اردو کا عملدرآمد یہی ہے۔ اس میں دلی لکھنؤ کی تخصیص نہیں ہے مجھے یاد نہیں رہا کہ جناب احسن نے چاہئیں کی تائید میں کیا دلائل قائم کئے ہیں۔ حضرت داغ کا کلام دفتر دفتر پیش نظر ہے۔ اگر چاہئیں مستعمل ہوتا۔ تو چاہئے تھا کہ سو دو سو جگہ تو آتا۔

اس میں شک نہیں جناب جلیل نے اس بحث پر معقولیت سے روشنی ڈالی ہے یعنی حکیم برہم کی طرح غیر متعلق باتیں نہیں چھیڑیں۔ مگر چاہئے کی تائید میں وہ بھی کوئی زبردست ثبوت پیش نہیں کر سکے۔ مثلاً یہ کہنے سے کیا سہارا مل سکتا ہے

کہ سب سے پہلے اس غلطی کی گرفت مدارالمہام دام اقبالہٗ نے فرمائی۔ یا اس بات سے کیا نتیجہ کہ چاہئے بجائے خود ایک لفظ ہے اور مناسب وزیبا کے معنی دیتا ہے۔ کیونکہ اس سے مستفسر کو کچھ تعرض نہیں۔ فارسی کے بایَد سے اردو کے چاہئے کا جوڑ ملانا بھی ٹھیک نہیں یہ کہنا بھی خلاف واقعہ ہے کہ تمام فصحائے اردو کا عملدرآمد یہی ہے اس میں دلی لکھنو کی تخصیص نہیں ہے داغ کا کلام دفتر دفتر موجود ہے۔ اور اسمیں چاہئیں کہیں مستعمل نہیں اس کے متعلق یہ بات دکھانی چاہئے تھی۔ کہ داغ مرحوم نے اسما کے جمع ہونے کی صورت میں بھی چاہئے ہی لکھا ہے۔ ورنہ "چاہئیں" کا عدم استعمال جناب جلیل کے دعوے کا کافی ثبوت نہیں ہوسکتا۔ اب ہم اس لفظ پر ایک غائر نظر ڈالنی چاہئے ہیں۔ پہلے ان ہردو الفاظ کی مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

پنجۂ خورشید کو کافی ہے اک جیبِ سحر — روز یاں دستِ جنوں کو سو گریباں چاہئے (ناسخ لکھنوی)

سر سے لینا چاہئے تائید یاری کے قدم — (مصرع مسدس امیر مینائی لکھنوی)

خار و خس تھوڑے ہیں سے آباد خرابی چاہئے — (مصرع غزل رند لکھنوی مرحوم)

دو چار رشکِ ماہ بھی ہمراہ چاہئیں — وعدہ ہے چاندنی میں کسی مہرباں سے آج (امانت لکھنوی)

ہر پل رہیں حسینوں سے نظارہ بازیاں — آنکھوں کے پردے چاہئیں لگو مکا نخیر (امانت لکھنوی)

ہم قیدیوں کو چاہئیں سونے کی بیڑیاں — اے چارہ گر جہاں میں ہے جلوہ گر بسنت (مومن دہلوی)

جو ہیں مرغِ تر دماغ اُنکے قفس کے واسطے — چاہئیں صندل کی جو ہیں اور خس کی تیلیاں (ذوق دہلوی)

روز محشر سے کئی دن دیکھنے کو چاہئیں — گر یہی اے ذوق طولِ نامۂ اعمال ہے (ذوق دہلوی)

بہت دن چاہئیں پہچان کو راہِ حقیقت کی — جنابِ خضر کیا جانیں کہ انکی خردسالی ہے (داغ دہلوی)

مندرجہ بالا اشعار کے ملاحظہ سے ناظرین کو معلوم ہوا ہوگا۔ کہ شعرائے دہلی و لکھنؤ نے "چاہئیں" اور چاہئے دونوں لفظ استعمال کئے ہیں۔ مگر ان میں صرف یہ فرق ہے کہ بعض شعرائے لکھنؤ نے اسماء کے جمع ہونیکی حالت میں بھی "چاہئے" لکھا ہے جیسا کہ ناسخ۔ امیر

اور رند کے اشعار سے ظاہر ہے اہل دہلی نے ایسا استعمال کہیں نہیں کیا۔ اور اگر کیا ہو تو بقول حکیم برہم صاحب "متقدمین شعرا جو بالکل آزاد تھے۔ اور جن کی زبان کی پیروی اس وقت نہیں کیجاتی"۔ اس معاملے کے متعلق بھی اُن کے کلام سے سند لینا فضول ہے دہلی کے شعرائے متاخرین نے متقدمین کی اکثر باتیں غیر فصیح سمجھ کر ترک کر دی ہیں۔ مثلاً لفظ سانس کو دہلی و لکھنؤ کے متقدمین مونث لکھتے تھے۔ مگر اب دہلی اس کو مذکر کہتے ہیں۔ اسمار کے جمع ہونے کی حالت میں دلّی کے لوگ "چاہیئے" نہیں بلکہ "چاہیئں" لکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

خیالات صادقہ کی ماں کے جو ایک ماں کو ہونے چاہئیں" از رویائے صادقہ صفحہ ۹ سطر اول مصنفہ جناب مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی

ہماری عقل تو اتنا بتاتی ہے۔ کہ خدا میں یہ صفتیں ہیں اور انتظام دنیا گواہی دے رہا ہے۔ کہ اس میں یہ صفتیں ہونی چاہئیں۔ رویائے صادقہ صفحہ ۱۷۶ سطر ۱۸۔

بلکہ رفتہ رفتہ مروّف غزلیں لکھنی کم کرنی چاہئیں مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۷۶

شاعری کے لئے اول قدرتی جوہر بعد اس کے چند تحصیلی و علمی لیاقتیں چاہئیں از نیرنگ خیال صفحہ ۱۱۳ مصنفہ مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی۔

یہ یقینی بات ہے۔ کہ اسماء کے جمع ہونے کی صورت میں موجودہ فصحائے دہلی "چاہیئے" ہرگز نہیں لکھتے۔ اس لفظ کے متعلق راقم کی ذاتی رائے یہ ہے کہ "چاہئیں" کی جگہ "چاہیئے" کا استعمال بعض موقعوں پر غیر فصیح ہونے کے علاوہ قطعاً غلط ہے مثلاً یہ فقرہ تحریر کیا جائے کہ "اس طالب علم کو ایسی کتب چاہیئے"۔ اس جملے میں لفظ کتب جمع ہے۔ مگر بعض ناواقف دھوکا کھا کر اس کو مفرد سمجھ سکتے ہیں۔ اگر یہی فقرہ یوں لکھا جائے۔ کہ "اس طالب علم کو ایسی کتب چاہئیں"۔ تو یہ واحد و جمع کا اندیشہ

باقی نہیں رہتا + دہلی کے فصحائے متقدمین و متاخرین کے کلام سے "چاہیئں" کا ثبوت پیش کر دیا گیا ہے۔ اب ناظرین خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ کہ حکیم برہم و جناب جلیل کا خیال کس حد تک درست ہے +

ہم نے حکیم برہم کے مضمون پر اگست ۱۹۰۷ء کے فصیح الملک میں بھی مندرجہ بالا خیالات ظاہر کئے تھے۔ ہمارے مضمون پر حکیم صاحب نے ۴۔ اکتوبر کے ریاض الاخبار میں حسب ذیل نوٹ تحریر فرمایا ہے :-

ہمارے دونوں نوٹوں اور حضرت جلیل کے مضمون پر اعتراض کیا گیا ہے .... ہم نے فیصلہ کیا تھا۔ کہ دہلی کی زبان سے ہم واقف نہیں۔ اگر وہاں بحالت جمع چاہیئں بولتے ہیں۔ تو کوئی اعتراض نہیں۔ لکھنؤ کی زبان میں "چاہیئں" نہیں دیکھا گیا + مضمون نگار صاحب نے امانت مرحوم اور مومن مرحوم کی سند میں جو شعر نقل کئے ہیں (یہ فقرہ بھی قابل ملاحظہ ہے۔ مؤلف) وہ قابل لحاظ نہیں اس لئے جب تک قافیے میں چاہیئں نہ دیکھا جائے۔ ہم مانتے نہیں۔ داغ مرحوم کا ایک شعر چار دیوانوں سے نکالا گیا ہے۔ شاید یہ شعر آخری دیوان میں ہے۔ اور سند کیلئے فرمایشی کہلوایا گیا ہے۔ جناب جلیل کا یہ اعتراض صحیح ہے کہ کثیر الاستعمال لفظ ضرور دس بیس جگہ دیکھا جاتا۔ روزمرہ میں جناب داغ مرحوم کی شہرت ہے۔ اور یہ ایک ایسا لفظ ہے جو زبان پر ہوتے ہوئے کسی دیوان میں نہیں دیکھا جاتا۔ بہرحال ہم نے اپنے دوسرے مضمون میں لکھ دیا تھا۔ کہ اگر اختلاف ہے تو کسی کو حق دوسرے پر اعتراض کا نہیں ہے۔ مگر مضمون نگار صاحب کا غصہ کم نہیں ہوا۔ مگر انہوں نے سمجھ لیا۔ کہ ناسخ۔ رند۔ امیر کا کیا طرز عمل تھا۔ اور ہم کو اسی سے بحث تھی۔ رہا یہ امر کہ جناب امیرؒ کا تتبع ہر شخص پر فرض نہیں ہے۔ ہم بھی مانتے ہیں۔ اور ہم کو اصرار نہیں۔ مضمون نگار صاحب امیر کو اُستاد سمجھیں + ہم نے لکھنؤ اور اس کی تبعیت کرنیوالوں

کے لئے لکھا تھا۔ اعتراض ہے کہ ہم نے لکھنؤ کی تتبع لکھ دیا۔ لکھنؤ کا تتبع لکھنا چاہئے تھا۔ یہ اعتراض ایسا ہے کہ ہم مضمون نگار صاحب کے مضمون کے متنفسر پر اعتراض کریں کہ مستفسر کی جگہ متنفسر بے معنی بے محل لکھ کر داد انشا پردازی ہے۔ یا اڈیٹر صاحب فصیح الملک کے "ایفا" پر اعتراض کریں کہ "ایطا" کی جگہ ایفا لکھ دیا۔ اخبار میں کتابت پر اعتراض نادانی ہے" *

ہم حکیم صاحب کو ایک اچھا انشا پرداز سمجھتے ہیں۔ اور جب ایک ایسے اخبار کو ان کی اڈیٹری میں دیکھتے ہیں۔ جو ۱۳ سال سے جاری ہے تو اس خیال کو زیادہ تقویت دینی پڑتی ہے۔ کیونکہ کسی پرانے اخبار کو ایڈٹ کرنا معمولی آدمی کا کام نہیں مگر جب بعض باتیں ان کے قلم سے ان کی شان کے برخلاف نکل جاتی ہیں۔ تو ہمیں رنج ہوتا ہے * چاہئیں کی بحث میں حکیم صاحب نے زبان دہلی پر جو پھبتیاں اڑائی ہیں۔ وہ ناظرین سے پوشیدہ نہیں۔ کہیں زبان دہلی پر پنجابیوں کا اثر بیان کر کے اس کو غیر فصیح ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کہیں اہل دہلی کے اختراع و تصرف کو بلا ضرورت بیان کیا۔ یہ باتیں حکیم صاحب کے رتبہ کے شایاں نہیں۔ اگرچہ وہ زبان دہلی کو بہت کچھ اچھا نہیں سمجھتے۔ اور اودھ پنچ میں دہلی کے مشہور اہل زبان کی بہت کچھ ہنسی اڑا چکے ہیں مگر کسی ظریف پرچہ میں ایسے مضامین لکھنا اور بات ہے۔ اور ریاض الاخبار جیسے مہذب و متین اور مشہور پرچے میں بحیثیت اڈیٹر ایسے خیالات ظاہر کرنا اور بات *

حکیم صاحب یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ اگر اہل دہلی "چاہئیں" بولتے ہیں۔ تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ پھر یہ بھی فرماتے ہیں۔ کہ داغ نے کہیں نہیں لکھا * ہم نے ان کا جو شعر تحریر کیا تھا۔ اس کی نسبت فرماتے ہیں۔ کہ فرمایشی کہلوایا گیا ہے۔ حالانکہ اس بحث سے بہت پہلے داغ مرحوم سفر آخرت اختیار کر چکے تھے اچھا ہم

یہہ بات مانے لیتے ہیں۔ کہ داغ نے چاہئیں نہیں لکھا۔ مگر اسماء کے جمع ہونے کی صورت میں "چاہیئے" بھی تو کہیں نہیں لکھا + مضمون لکھنے کا مزا جب تھا۔ کہ داغ کے کلام سے بحالت جمع "چاہیئے" کا ثبوت دیا جاتا + اور پھر ہم سے کہا جاتا کہ تمہارا کہنا غلط ہے + ہم نے تو اپنے دعوے کی تائید میں ایک شعر پیش بھی کردیا مگر حکیم صاحب اللہ چاہے ایک مصرع بھی پیش نہ کرسکیں گے + ہم کہتے ہیں۔ کہ "چاہئیں" کثیر الاستعمال نہ سہی حکیم صاحب کے نزدیک (بحالت جمع) "چاہیئے" تو کثیر الاستعمال ہے۔ وہ کلام داغ سے اسی کا ثبوت دیں + دہلی میں بحالت جمع "چاہیئے" کوئی نہیں بولتا۔ ہم نے جو اقتباسات نثر پیش کئے ہیں۔ وہ اس کے زبردست شاہد ہیں۔ اور جن کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ بفضلہ تعالیٰ اُن کے مصنف ابھی زندہ ہیں جس شخص کا جی چاہے اُن سے دریافت کرسکتا ہے۔

یہ دوسری بحث ہے کہ لکھنؤ میں بھی چاہئیں مستعمل ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ اسماء کے جمع ہونے کی صورت میں "چاہیئے" بولنا لکھنؤ کے فصحائے متقدمین کی زبان تھی۔ اب یقیناً اہل لکھنؤ بھی "چاہئیں" ہی بولتے ہیں۔ اہل لکھنؤ کی کتب نثر اٹھا کر دیکھ جائیے۔ ہمارے قول کی تصدیق ہوجائے گی۔ زیادہ نہیں۔ تو رسالہ "پیام یار" لکھنؤ ہی دیکھ لیا جائے۔ اُس میں ہمیشہ "غزلیں آنا چاہییں" لکھا رہتا ہے۔ نہ کہ "غزلیں آنا چاہئے" +

ہم منشی امیر احمد صاحب کو استاد ضرور سمجھتے ہیں۔ اور کوئی متعصب اور برہم مزاج آدمی ہم سے زیادہ اُن کی قدر نہیں کرسکتا + تتبع کی نسبت تو حکیم صاحب نے یہ کہہ کر بات بنا دی۔ کہ کتابت کی غلطی ہے۔ مگر ہم اس کو "بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا" کا مصداق سمجھتے ہیں۔ اگر ہمارے اور اڈیٹر صاحب فصیح الملک کے مضمون میں کتابت کی غلطیاں نہ ہوتیں۔ تو حکیم صاحب کو یہ بات بنانے کا

موقع نہ ملتا۔ مگر حکیم صاحب نے تتبع کے علاوہ اپنی لکھنوی زباندانی کے ثبوت میں یہ فقرہ بھی لکھا تھا۔ کہ "اُن کے عنایات کا شکریہ ادا ہونا مشکل ہے"۔ ہم نے اعتراض کیا تھا۔ کہ اہل لکھنؤ لفظ عنایات کو مذکر نہیں بولتے۔ بلکہ مفرد و مونث کہتے ہیں + افسوس حکیم صاحب نے اس اعتراض کا کچھ جواب نہیں دیا۔ شاید اس میں کاتب کی غلطی نہیں۔ بلکہ خود حکیم صاحب ہی کو سہو ہوا ہوگا +

آخر میں ہم حکیم صاحب سے بادب التماس کرتے ہیں کہ وہ دہلی و لکھنؤ کے اختلافات پر زیادہ توجہ نہ فرمائیں۔ اب وہ زمانہ گذر گیا۔ جملہ اہل زبان کو اردو کی توسیع و اشاعت میں متفق ہو کر کوشش کرنی چاہیئے + فضول تُو تُو مَیں مَیں سے کیا فائدہ؟

چھان بنان۔ تحقیق کرنا کسی امر کا جیسا کہ چاہیئے" از رسالہ زبان اُردو مؤلفہ جناب [illegible] لکھنؤ میں [illegible] بولا جاتا ہے۔ [illegible] ہے

دل اندھا دُھند ہی آتا ہے ہمیشہ اے داغ ۔۔۔ چھان بین آپ نہیں کچھ چھان پھٹک کرتی ہے (داغ دہلوی)

چھپنا۔ پوشیدہ شدن کا ترجمہ۔ فصحائے لکھنؤ کی زبان پر بالکسر ہے۔ اور اہل دہلی بالضم بولتے ہیں۔ یعنی چِھپنا اور چُھپنا +

حرف ح

حضور۔ اہل لکھنؤ معشوق کو اس لفظ سے مخاطب کرتے ہیں ؎

آنکھیں ملائیں آپ تو کچھ دردِ دل کہوں ۔۔۔ پھر وں مزاج ہی نہیں ملتا حضور کا (امیر مینائی)

یہ ٹھوکریں دمِ رفتار پڑتی تھیں کس پر ۔۔۔ حضور میرا دل پائمال تھا کیا تھا۔ (جلال لکھنوی)

اہل دہلی کے ہاں اس قسم کا استعمال نہیں پایا جاتا۔ خصوصاً نواب فصیح الملک داغ مرحوم نے اس طرح کہیں نہیں لکھا۔ بلکہ ایک مرتبہ راقم الحروف نے ایک

غزل میں ایسا ہی استعمال کیا تھا۔ تو اُس پر داغ مرحوم نے فرمایا تھا کہ ہم معشوق کو لفظ حضور سے مخاطب نہیں کرتے۔ فصیح الملک حضرت داغ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کی شان میں اس کا استعمال مناسب سمجھتے تھے۔ یوں خطاب ہونے کی وجہ سے انہوں نے نظام دکن کو بھی لفظ حضور سے مخاطب کیا ہے۔ مگر اس کی صورت جداگانہ ہے

حلوا نکل جانا۔ کنایہ ہے بے حال ہو جانے سے بسبب سختی و شدت۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے ۔

حرف د

دسترس۔ یہ لفظ لکھنؤ میں مذکر بولا جاتا ہے۔ ؎

ہیہات دسترس ہوا ہم کو نا قدم ہاتھوں میں اس کے رنگ حنا نے جما لئے (الفت لکھنوی)

کبھی پیری کبھی گیسو تک اس کے دسترس ہوگا مثال شانہ عقدہ کھول دوں گا تیری لٹ کا (رند لکھنوی)

کھینچ لو ہاتھ جو کچھ دسترس انساں کا ہو توڑ کر بیٹھ رہو پاؤں کو زانو کی طرح (جلال لکھنوی)

اہل دہلی عموماً مونث بولتے ہیں ۔

لب تک اس کے جو ہوئی دسترس جام شراب بن گیا خالِ لب اُس کا عکس جام شراب (ذوق دہلوی)

منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی نے بھی اس لفظ کو مونث باندھا ہے۔ ؎

نہ قدموں تک اُس کے ہوئی دسترس حنا دست افسوس ملتی رہی۔ (امیر مینائی)

مگر صحیح یہی ہے کہ اہل لکھنؤ مذکر اور اہل دہلی مونث بولتے ہیں ۔

دمانا تلوار کا۔ جھکانا اس کی پختگی و خامی کی آزمائش کے واسطے۔ ؎

یار کی ٹیڑھی نگہ بھی لطف سے خالی نہیں ہو اگر تلوار اصیل اس کو دمایا چاہیے (ناسخ لکھنوی)

لکھنؤ میں بولا جاتا ہے دہلی میں نہیں سنا گیا ۔

دھاگا دینا۔ بمعنی فریب دینا دھوکا دینا۔ یہ بھی لکھنؤ میں مستعمل ہے۔ ؎

ہے بندوبست حسن خط زلف عارضی ۔۔۔ دھاگا نہ دیجئے کہیں دامن کے کنارے سے (رشک لکھنوی)
دہلی والے دم یا چھالنا دینا بولتے ہیں ۔۔۔ سے (رشک لکھنوی)

دھنگارنا۔ دال بچنے کو گھی سے بودار کرنے کا نام ہے۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔ اہل دہلی اس کے عوض بگھارنا کہتے ہیں ۔

حرف ڈ

ڈانڈا۔ ملک کی سرحد۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔

گیسو نے قرب آتش رخ سے ہے پایا ۔۔۔ ڈانڈا ملا دیا ہے جاسے بہار کا (دانش لکھنوی)

شاید دلی میں بھی بولا جاتا ہو۔ مگر راقم نے نہیں سُنا۔ اور نہ کسی شاعر کے کلام میں دیکھا۔

ڈھکیلنا۔ پیچھے سے کسی کو ریلنا۔ اہل لکھنؤ اسی طرح بولتے ہیں۔ دہلی والے دھکیلنا کہتے ہیں ۔

ڈھیرا۔ جس کی آنکھ میں بھینگا پن ہو۔ اور ایک کو دو دیکھتا ہو۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔ دلی والے یہ مفہوم لفظ بھینگا سے ادا کرتے ہیں ۔

حرف ر

راٹھی۔ ایک چیز ہوتی ہے مانند ملائی کے (از سرمایۂ زبان اردو مؤلفہ جلال لکھنوی) لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔ جو چیز ملائی کے مانند ہوتی ہے۔ دلی میں اسے رٹھی کہتے ہیں۔ راٹھی بھی اطراف دہلی میں ایک گنواری لفظ ہے۔ جوار۔ باجرے یا مکی کا ملین آٹا جو موسم گرما میں اکثر گنوار لوگ کھایا کرتے ہیں۔ وہ اپنی زبان میں اسے راٹھی کہتے

ہیں ۔

حرف ز

زرا ۔ ایک کلمہ ہے کہ لفظ اندک اور قلیل کے معنی کا فائدہ دیتا ہے ۔ اور جو اس لفظ کو ذال معجمہ سے لکھتے ہیں مولف بیچمدان کے عندیہ میں خطا پر ہیں ۔ کیونکہ ذال معجمہ کا وجود جب فارسی زبان میں بعض محققین کے نزدیک نہیں ہے تو کلمات ہندیہ میں کیونکر مسلم رکھا جائیگا ۔ (از سرمایہ زبان اُردو جلال)

اس لفظ کو اہل دہلی ذ سے لکھتے ہیں ۔ اور اہل لکھنؤ ز سے ۔ اس کی بحث رسالہ فصیح الملک میں ضرورت سے زیادہ ہو چکی ہے ۔ فصیح الملک کے ایک قابل نامہ نگار مولوی خان دوراں خاں بریلوی نے فارسی میں ذ کا وجود بخوبی ثابت کر دیا ہے ۔ اُن کے مضمون کا کچھ حصہ یہاں بھی درج کیا جاتا ہے :۔

"اہل عجم کے کلام میں دال نقطہ دار برابر موجود ہے ۔ خواہ اس کو عرب کا تصرف سمجھو یا اسلامی فیضان ۔ حق یہ ہے ۔ کہ فارسی میں دال مہملہ کا وجود نہیں ۔ یعنی ایسی دال جس کے ماقبل رے مہملہ ۔ زے معجمہ اور نون کے علاوہ کوئی اور حرف ہو ۔ وہ فارسی دال نہیں ہے ۔ فارسی دال کے ماقبل ر ۔ ز ۔ ن ضرور ہوتا ہے ۔ جیسے مرد ۔ درد زرد ۔ مزد ۔ ہند ۔ سند ۔ پند ۔ وغیرہ ...... اگر ماقبل دال مہملہ متحرک ہو یا ماقبل حروف علت ساکن ہو ۔ تو وہ ذال معجمہ ہے ۔ ؎

ماقبل وے ار ساکن جز وائے بود ۔ دال است وگرنہ ذال معجم خوانند

اسی لئے داذ ۔ دوذ ۔ دید ذال معجمہ سے ہیں ۔ اسی طرح وہ ذال معجمہ جو آخر کلمہ فارسی میں آتی ہے تین قسم ہے ۔ حرف مضارع جیسے دہد ۔ آید ۔ رود ۔ حرف ربط جیسے عالمید فاضلید ۔ کروید ۔ گفتید ۔ حرف دعا دہاد ۔ کناد ۔ باد ۔ مباد ۔ ان لفظوں کا باہم قافیہ کرنا غزل میں معیوب ہے ۔ قصیدے میں جائز ہے ۔ اگر ذال معجمہ ساکن

اور ذال معجمہ متحرک دونوں ایک جا جمع ہوں۔ تو ایک ذال کو حذف کر دیتے ہیں۔ جیسے سپید دیو سے سپیدیو۔ مولانا فتح علیخاں ملک الشعرائے ایران ؎

چشم من دُور از غبار مرکب دارآ رسے — شد ز نیرنگ سپیدیو فلک چوں چشم کے

حکیم ابوالقاسم فردوسی ؎ سپیدیو از تو ہلاک آمدہ — مرا از تو ہم سر بخاک آمدہ ٭

اور جب ذال حرف قریب المخرج کے ساتھ ہوتی ہے تو حذف کا قاعدہ ہے جیسے بدتر سے بتر۔ زودتر سے زوتر۔ مولانا سپہر لسان الملک ایران ؎

بغیر زور نہ بکشائے کار بستہ بند۔ — بجز زوتر و بربند دست فتنہ بزور

متقدمین نے دال مہملہ کا ذال معجمہ کے ساتھ جہاں کہیں قافیہ کیا ہے تو عذر بھی فرمایا ہے۔ گویا وہ لوگ عیب سمجھتے تھے۔ حکیم انوری

خداوند من عصمت الدین ہمیشہ	بجز ساکن ستر عصمت مبادی
توئی عالم داد و دیں را مدبّر	نہ بلکہ خود عالم دین و دادی
نشاید فراموش کردن کسے را۔	کہ در ہر دعاء و ثنائیش بیادی
چہ گر دعاء قافیہ دال گردد۔	چو لفظ معادی مثل با مبادی
بیک قافیہ سند عیبے نباشد	نگوئی کہ ناید ز من سند بادی
معادی عبادت دگر چارہ نبود۔	مبادی تو ہرگز بکام معادی

مولانا سعدیؒ نے اس قید کو توڑ دیا۔ اور یہاں تک وسعت دی کہ فارسی قافیوں کے ساتھ عربی قافئے بھی سمانے لگے۔ جیسے داد اور افتاد کے ساتھ نفاذ معاذ۔ ملاذی اور وادی۔ خوشنود اور ماخوذ۔ کاغذ اور بغداد۔ لغت عرب میں دال سے بھی ہے اور ذال سے بھی آیا ہے۔ مولانا روم ؎

گر بگویم شرح آں بے حد شود۔ — مثنوی ہفتاد من کاغذ شود۔

یہ صحیح ہے۔ لیکن اہل بخارا دال ذال میں فرق نہیں سمجھتے۔ اور جناب

مولوی بھی بہت کم لحاظ فرماتے ہیں۔ اس شعر میں تو متقدمین کی اقتدا کی ہے۔ ؎

ان نیا ہم من کہ مخلص ہا شت بود — تو اعوذ آری و من خود آں اعوذ۔

مگر اکثر شعر والی میں دال ذال کا فرق اٹھا دیا ہے۔ جیسے ؎

کم کنی ایشاں ز کشتن سود نیست — دیں ندارد بوسہ شکر عود نیست

مے کشندشاں سوئے کنگرہ سوئے بد — گفت حق فی جیدہا حبل مسد۔

متاخرین نے حضرت مولانا ہی کی تقلید فرمائی ہے۔ مولانا جامی ؎

بر من از جور تو ہر چند کہ بیداد رود — چوں رخ خوب تو بینند ہمہ از یاد رود

دل بآں غمزۂ خونریز کشد جامی را — صید را چوں اجل آید سوئے صیاد رود

اس تحریر سے فارسی میں ذال کا وجود ثابت ہو گیا ہے۔ اب ہم جناب تمنا لکھنوی کا عجیب و غریب مضمون بھی ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ اور اڈیٹر صاحب فصیح الملک نے جو رائے اس پر ظاہر کی ہے اس کا اندراج بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ گو ان کے پڑھنے میں تضیع اوقات ہو گی۔ مگر ناظرین طرز استدلال سے واقف ہو جائینگے۔

سمع خراشی معاف

ذرا کی نسبت جناب اڈیٹر صاحب فصیح الملک نے جو جواب لکھے ہیں۔ اور اس کا املا ذال صحیح ہونے کی بابت بحث و استدلال میں مبالغہ فرمایا ہے اس کے متعلق میں اپنے پہلے مضمون کے آخر میں کچھ سمع خراشی کرنے کی ضرورت ظاہر کر چکا ہوں لیکن اس کا التوا صرف اسی انتظار میں رہا۔ کہ میرے مضمون کی نسبت کیا تحریر فرمایا جاتا ہے۔ شاید بالفعل اسی کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت پڑے۔ اور اس سمع خراشی کی نوبت آخر میں آئے۔ الحمد للہ کہ صرف ڈیڑھ ہی سطر کے جواب پر اکتفا فرمائی گئی ہے۔ جس کا جواب الجواب بھی اسیقدر کافی ہے۔ کہ میرے نزدیک تو

حسب الارشاد تحقیق لغت ہی میں کوشش ہوئی ہے۔ کیا زرا کی بحث و تحقیق تحقیق لغت سے خارج ہے؟

اب ہم بر سر مطلب بیت کے نمبر میں شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب کے مضمون کے ذیل میں جناب اڈیٹر صاحب نے جو خامہ فرسائی فرمائی ہے اور استفسار کا جواب دیا ہے پہلے اس سے شروع کرتا ہوں کہ وہ بوجوہ ذیل میرے نزدیک ناکافی ہے +

زرا کو وصل بلگرامی کے ہندی لکھنے پر جناب مولانا ذکاء اللہ صاحب کا اعتراض کہ زرا اگر ہندی ہوتا۔ تو جرا ہوتا۔ اس لئے کہ ہندی شبد[1] جن میں زاء معجمہ نہیں ہے۔ عربی لفظ ذرہ کا ذرا مخفف ہے۔ پھر جناب اڈیٹر صاحب کی اس پر یہ رائے کہ عام طور سے ہر شخص ہندی سے بھاشا یا سنسکرت مراد لیتا ہے مگر بزعم خود وصوف (وصل بلگرامی) کا بھی یہی مطلب ہے۔ تو مولانا کا یہ جواب نہایت معقول ہے۔ کہ اگر یہ لفظ ہندی ہوتا تو جرا ہوتا نہ زرا۔ سبحان اللہ! مجھ کو جناب مولانا اور اڈیٹر صاحب سے لائق اصحاب کا ہندی سے خاص بھاشا یا سنسکرت مراد لینا ایک قابل تعجب و افسوس امر معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اردو کے تمام اہل زبان اور زبان دان برابر لفظ ہندی کو مفید یعنی اردو سمجھتے ہیں۔ اور اکثر اس لفظ سے اردو مراد لیتے ہیں۔ اور یقیناً وصل بلگرامی کی مراد بھی ہندی سے اردو ہی ہے۔ جیسا کہ ان کی استفسار کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ بھاشا یا سنسکرت زبان کے متعلق استفسار یا تحقیق نہیں کر رہے ہیں۔ اور نہ شاید ان زبانوں کو جانتے ہونگے۔ (آپ تو ماشاءاللہ ان کے استاد ہیں۔ آپ کو اتنی بھی خبر نہیں۔ مؤلف) بڑے مزے کی بات ہے کہ ادھر تو ہندی سے بھاشا یا

[1] یہ دونوں لفظ یعنی بن اور جن الگ الگ سمجھ میں نہیں آئے کہیں بخن۔ و بخن تو نہیں کہ ہندی خاص میں حروف بلا اعراب کو کہتے ہیں۔ اس کے دو ٹکڑے کرکے (بل کہ) اور (علاجارہ) کی طرح یہ گت بنائی گئی ہو کیونکہ سُر کے ساتھ ہیں جو کہ اعراب اور حروف ہندی کا نام ہے۔ یہ ایک لفظ بخن و بخن ہی معلوم ہوتا ہے +

سنسکرت مراد لی جاتی ہے۔ اور ادھر ہندی وہ الفاظ کہے جاتے ہیں۔ جو کسی دوسری زبان سے لیکر اردو بنائے جاتے ہیں۔ نہ کہ بھاشا یا سنسکرت + اس امر کے ثبوت کے لئے اڈیٹر صاحب کہیں دور کیوں جائیں۔ اسی بحث میں تیسرے نمبر کے پانچویں صفحے کی اکیسویں سطر میں استفسار کے جواب کا پہلا فقرہ خاص اسی لفظ کی نسبت جو خود تحریر فرماتے ہیں۔ (ذرا یقیناً ذرے کا ہندی ہے۔) ملاحظہ فرمائیں اور انصاف کریں کہ ہندی سے ان کی مراد آیا یہ ہے کہ ذرا بھاشا یا سنسکرت ہے۔ اگر ہندی سے ہر شخص اُن کے قول کے موافق عام طور سے بھاشا یا سنسکرت ہی مراد لیتا ہے۔ تو انھوں نے ہندی سے اردو کیوں مراد لی؟ ہندی کی جگہ مورد استعمال کرنا لازم تھا۔ نہیں انھوں نے بہت ٹھیک مراد لی۔ اور تمام اہل زبان اور زباندان ایسا کرتے ہیں۔ البتہ پیشتر جو مولانا صاحب کے جواب پر رائے ظاہر کی ہے۔ وہ ایک حد تک کمزور ہے۔ اور محض تائیدی کلام ہے کیونکہ۔ اس کی تردید خود ان کی تحریر سے ظاہر ہے پس جہانتک میرا خیال ہے مستفسر کی مراد ہندی سے بھاشا یا سنسکرت ہرگز نہیں۔ بلکہ اردو ہے (تو پھر اردو ہی کیوں نہیں لکھ دیا تھا۔ مولف) اور ایسا جواب جو کسی سوال کے اصل مفہوم سے بالکل الگ ہو اور اس کے الفاظ سے اپنے حسب دلخواہ مراد لے کر دیا جائے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس درجے تک معقول ہے (ذرا) جو ذرے کا ہندی یا مخفف یقین کر لیا گیا ہے وہ کسی واجبی استدلال کے ساتھ نہیں۔ غالباً اسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ ذرّہ اور ذرا چونکہ بہت ملتے جلتے الفاظ ہیں۔ اس لئے یقین کر لیا۔ کہ ذرّے ہی سے ذرا بنا ہے۔ اور ذرا (ذرا) کو شاید ایک ہی سمجھے۔ (جی ہاں اُن بزرگوں کو اتنی تمیز کہاں تھی۔ مولف) جناب بحر مرحوم فرماتے ہیں ؎

ایک ذرّے سے جو ذرّہ حال روشن ہو گیا   تل کا دانہ دیدۂ عارف میں خرمن ہو گیا۔

میر وزیر علی صبا کہتے ہیں۔ ؎

دنیا کو سمجھتے ہیں تیرے در کے گدا خاک ذرہ بھی نہیں ہے زرقاروں کی یہاں قدر

مگر شاذ ایسا استعمال ہوا ہے۔ اور آخر محققین فصحا نے متروک ہی ٹھیرا کے چھوڑا۔ اُسی بنیاد پر چند متاخرین ذرا (زرا) کا ذرّے ہی سے بنا قیاس کرکے ذال کو ہریل کی لکڑی کیطرح پکڑے ہوئے ہیں۔ اگر ذرا اور زرا کی مشابہت پر یہ قیاس ہے۔ تو ذری (زری) کی نسبت کیا کہا جائیگا۔ جو کہ ذرا کا مترادف ہے۔ جیسے غالب دہلوی مرحوم کے اس شعر میں ؎

اور مٹھائی جو کبھو ایک زری کھائے اک بار تو بھر جائے جی

لکھنؤ میں اب تک خاص وعام کی زبان پر جاری ہے۔ جو کچھ زمانے کے بعد شعرا نے اپنے کلام میں اس کا لانا بھی ترک کر دیا ہے۔ (متروک لفظ کی سند پیش کرنے سے فائدہ؟ مؤلف) علاوہ اس کے بہت الفاظ مختلف زبانوں پر ایسے موجود ہیں جو باہم ملتے جلتے ہیں اور ایک دوسرے سے بنے نہیں ہیں۔ (یہاں مضمون نگار نے چند الفاظ لکھے ہیں جو بخیال طوالت قلم انداز کر دئے گئے مولف)
پس ایسی حالت میں ذرا (زرا) کو ذرّے سے مشابہت ہونے کی وجہ سے خواہ مخواہ مہند قرار دینا اور ذرّے کی ذال کو زبردستی کھینچ کھانچ کر ذرا (زرا) میں ٹھونسنا بے جا ہٹ اور سخن پروری کے سوا کیا کہا جائے +

وصل بلگرامی نے استفسار میں جو ذرّے سے ذرا (زرا) بنانے کی نسبت قاعدے کا لفظ استعمال کیا۔ اس پر یہ اعتراض فرمایا گیا ہے۔ کہ (یہ عجیب سوال ہے غالباً مستفسر نے اور تمام مہند الفاظ کے بنانے کا قاعدہ دریافت کرلیا ہے الخ) اس کا جواب میرے نزدیک صرف اسی قدر کافی ہے کہ اس لفظ قاعدہ سے تمام مہند الفاظ بنانے کا کلیہ قاعدہ مراد نہیں۔ بلکہ وہی مفہوم ہے۔ جو فصیح الملک نمبر ۳ کے چھٹے صفحہ کی گیارھویں سطر میں خود جناب ایڈیٹر صاحب کا ہے۔ اور

ذرا میں ذال معجمہ ہونے کی دوسری وجہ معقول میں تحریر فرمایا گیا ہے۔ کہ دہر ترقی یافتہ زبان میں یہ قاعدہ دیکھا جاتا ہے۔ الخ) پس زرا کی نسبت لفظ قاعدہ استعمال کرنے کے اغراض میں خود اپنی ہی مثال مذکورہ بالا ملاحظہ فرمائی جائے۔ ذرّے سے ذرا بنانے کی جو فصیح اور سہل ترکیب تیسرے نمبر کے چھوٹے صفحے میں تحریر کی گئی ہے۔ کہ (حرکت کے مقابل میں تشدید ثقیل ہے۔ اس لئے ذرّے سے تشدید اُڑا دی۔ جب تشدید نہ رہی۔ تو ہائے مختفی جو ہندی میں کوئی وقعت ہی نہیں رکھتی کیا رہ سکتی تھی؟) اب یہاں ایک سوال اَور علاوہ اس بحث کے یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ ہائے مختفی بالکل بے وقعت تسلیم کر کے اُردو سے کیوں خارج کر دی گئی؟ جب کہ اس کے آگے خود تیسری سطر میں ارشاد ہوتا ہے۔ کہ (اردو ہی دنیا بھر میں وہ زبان ہے جس میں تمام جہان کے الفاظ و حروف بے تکلف آسکتے ہیں۔ کیونکہ اس غریب ستّ بجے کا خمیر ہی سات پانچ کی ہانڈی میں اٹھا ہے) گستاخی معاف۔ پھر بیچاری ہائے مختفی نے کیا قصور کیا ہے۔ جو بے وقعت کر کے دُودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر کر دی گئی۔ پھر ہائے مختفی تو بے وقعت ہونے کی وجہ سے دور کر کے اس کی جگہ پر الف داخل کیا گیا۔ اور ذال کی نسبت خود فرمایا جاتا ہے۔ (یہ شبہ کہ جب اتنا تغیر کیا۔ تو حرف ذال جو ہماری زبان پر ثقیل ہے۔ کیوں نہ چھوڑ دیا گیا۔) اس کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں۔ اول تو وہی کہ اردو ہی دُنیا بھر میں وہ زبان ہے۔ جس میں تمام جہان کے الفاظ و حروف بے تکلف آسکتے ہیں الخ

اس سے یہ غرض کہ جب اُرْدُو کو عمرو عیار کی زنبیل یا ایسا گڑھا سمجھ لیا۔ کہ جس میں جہان بھر کا کوڑا کرکٹ بھر دیا جا سکے۔ تو ذال کو بھی رہنے دیا۔ ثقیل ہو تو ہوا کرے۔ سبحان اللہ ذرا میں ذال داخل رہنے کے لئے تو اردو تمام جہان کے الفاظ و حروف کا خزانہ ٹھیرائی گئی۔ اور ہائے مختفی کھوٹے سکے کی طرح ٹکسال

باہر کر دی گئی۔ تعجب ہے۔ کہ اس کی گنجائش ایسے وسیع مخزن میں کیوں نہ رہی اس کا جواب محققانہ اور مدلل ضرور تحریر فرمانا چاہئے۔ اب ذال کو خود ثقیل تسلیم کرکے اور ذرا (زرا) کے سپر بار عظیم ڈال کر اس زرا سے اردو لفظ کو جبرً ثقیل بنانے کے لئے جو یہ فقرہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ (اردو ہی دنیا بھر میں وہ زبان ہے الخ) میرے نزدیک تو درست نہیں۔ بلکہ شاید کوئی بھی جس کو زبان اُردو سے مذاق ہوگا۔ درست نہ سمجھے گا۔ اور میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ خود اڈیٹر صاحب ہی کے نزدیک اُن کا یہ قول نادرست ہے اور منشاء اجرائے فصیح الملک ہی ایک اس امر کا کافی ثبوت ہے لیجئے ذرا میں ذال ہونے کی پہلی وجہ تو یہی فقرہ تھا۔ کہ جس کی یہ کیفیت ہے۔ رہی دوسری وجہ جس کی نسبت تحریر فرمایا گیا ہے۔ کہ (دوسری وجہ معقول یہ ہے۔ کہ ہر ترقی یافتہ زبان میں یہ قاعدہ دیکھا جاتا ہے۔ کہ جس زبان سے جو لفظ لیا جاتا ہے۔ شناخت کے لئے کوئی نہ کوئی حرف اصل ماخذ کا رہنے دیا جاتا ہے۔ جس سے علم اللسان کے ماہروں کو اس لفظ کی تاریخ معلوم کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اور گویا وہ ایک حرف اپنے ساتھ تاریخی دفتر لئے ہوتا ہے۔) اس وجہ کو بھی میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ کس درجے تک معقول ہے کیونکہ اس کے ثبوت و استدلال میں اڈیٹر صاحب کا کچھ انگریزی الفاظ پیش کرنے کا ارادہ تھا۔ مگر انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے مجبور رہ گئے اور دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں (بدقسمتی سے میں انگریزی نہیں جانتا۔ ورنہ بہت سے الفاظ دکھاتا۔ جن میں وہ حروف جن کو انگریزی میں سائیلنٹ کہتے ہیں۔ موجود ہیں۔ غالباً ایسے خاموش حرف زبان حال سے اپنی اصلیت کا پتا دیتے ہیں۔) نہیں معلوم اڈیٹر صاحب نے عربی اور فارسی کے بہت الفاظ کیوں نہ دکھا دیئے۔ اس لئے کہ ان زبانوں کو تو جانتے ہیں۔ خیر اُن کی اس بدقسمتی میں میں بھی شریک ہوں بلکہ ان سے زیادہ بدقسمت ہوں۔ کہ انگریزی

مطلق نہیں جانتا۔ وہ تو بھلا سائنٹیفک وغیرہ الفاظ انگریزی اور کچھ ان کے معنی سے آگاہی بھی رکھتے ہیں۔ اپنی تحریر میں استعمال بھی کرتے ہیں۔ میں بدنصیب تو اتنا بھی نہیں۔ اس لئے میں اپنے ثبوت و استدلال میں صرف عربی فارسی اور اردو ہی کے الفاظ پیش کرونگا۔ اور شاید اس موقع پر اور بحث کے لئے بہ نسبت انگریزی ایک غیر زبان کے وہ مناسب اور معتبر بھی ہونگے۔ میرے نزدیک ہمیشہ ہرگز اس کا خیال نہیں کیا جاتا۔ کہ جس زبان سے جو لفظ لیا جائے۔ شناخت کے لئے کوئی نہ کوئی حرف اصل ماخذ کا رہنے دیا جائے۔ اور نہ اس کی چنداں ضرورت ہے۔ بالخصوص عربی اور فارسی میں جن کی متبع اردو زبان ہے کیونکہ ہر زبان میں کثر الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن میں اس زبان کے حرف مخصوصہ میں کا کوئی نہ کوئی حرف ضرور ہوتے۔ پس جو الفاظ ایک زبان سے دوسری زبان میں لئے جاتے ہیں۔ زیادہ تر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کہ ان میں اصل زبان کا کوئی مخصوص حرف موجود نہیں ہوتا۔ پھر بھلا ان کی شناخت کیونکر ہوتی ہے۔ اور کونسا حرف اپنا تاریخی دفتر کھولتا ہے۔ وہاں تو جس زبان میں وہ الفاظ لئے جاتے ہیں اکثر اس زبان کے کسی نہ کسی حرف مخصوصہ کا تصرف اسمیں ہوا کرتا ہے۔ جس سے کوئی شناخت یا علامت اصل زبان کی نہیں مفہوم ہوتی۔ مثلاً تارم[1] (فارسی) طارم (معرب) توس (فارسی) طوس (معرب) کہران (فارسی) قہران (معرب) تشت (فارسی) طشت (معرب) وغیرہ ٭

بعض الفاظ میں ایسا تصرف کیا جاتا ہے۔ کہ التباس تلفظ بھی باقی نہیں رہتا جس سے اصل زبان کی کچھ بھی شناخت ہو سکے مثلاً کادس (فارسی) اور قابوس (معرب)۔ تسو (فارسی) اور تسوج (معرب) تالسان (فارسی) اور طیلسان (معرب) تیہو (فارسی) اور طیہوج (معرب) کبک (فارسی) اور قبج (معرب) تولا اردو اور تولچہ

[1] بہت الفاظ تھے جو بخیال طوالت چھوڑ دیئے گئے۔ مولف ۱۲

(مفرس) نگاردوا اور تنکہ (مفرس) وغیرہ پس ایسی حالت میں ذال کی پچڑ ذرا (زرا) میں ٹھنکی رہنے کی جو دوسری وجہ معقول تحریر فرمائی گئی ہے میں تو کبھی اسے معقول نہیں کہہ سکتا۔ اور نہ استدلال کے لئے کافی سمجھتا ہوں۔ بلکہ اڈیٹر صاحب کے خیال کے برعکس یہ دیکھتا ہوں کہ جس زبان کے الفاظ میں کوئی حرف مخصوص اُس زبان کا ہوتا ہے۔ اور وہ الفاظ کسی ایسی دوسری زبان میں لئے جاتے ہیں۔ جن میں وہ حرف نہیں تو ہمیشہ اور ہمیشہ نہیں تو اکثر وہ حروف مخصوصہ باقی نہیں رکھے جاتے اور دوسرے حرف سے تبدیل کر دئے جاتے ہیں۔ اور زیادہ تر ایسا ہوتا ہے۔ کہ اہل تصرف کوئی حرف خاص اپنی زبان کا داخل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ فارسی کے چاروں حروف مخصوصہ (پ۔ چ۔ ژ۔ گ) کی حالت ملاحظہ ہو۔ سپاہان (فارسی) اور صفاہان۔ (معرب) سپیل بمعنے آواز طایر (فارسی) اور صفیر (معرب) چین (فارسی) اور صین (معرب) کژ بمعنے ریشم (فارسی) اور قز (معرب) گوہر (فارسی) اور جوہر (معرب) لگام (فارسی) اور لجام (معرب) لیجئے سپاہان و سپیل کی بائے فارسی اور چین کا جیم فارسی اور کژ کی زائے فارسی اور گوہر و لگام کا کاف فارسی سب تبدیل کر ڈالے گئے۔ اور امثلہ مذکورہ میں جہاں خاص حروف عربیہ کا تصرف ہوا ہے۔ وہاں حروف عجمی کی بھی خبر ضرور لے لی گئی ہے۔ تاریخ معلوم کرنے یا شناخت کے لئے ان کو باقی نہیں چھوڑا۔ اسی طرح بہت سے الفاظ مل سکتے ہیں۔ اور اڈیٹر صاحب کو اپنے دعوے کے ثبوت کے لئے شاید تھوڑے الفاظ بھی نہ مل سکینگے۔ کہ جو کسی زبان کے لئے باعتبار حروف مخصوص ہوں اور ایسی دوسری زبان میں جا کر تاریخ معلوم کرنے کیلئے وہ حروف خاص رہنے دئے گئے ہوں جس میں وہ نہیں ہوتے اور اگر ملیں گے بھی تو ایسے ہی ملینگے۔ مثلاً عبدالرحمٰن۔ جیسا کہ تحریر فرماتے ہیں۔ اردو میں عبدالرحمٰن کی دال اور رے کے درمیان اَل کیوں لکھتے ہیں؟ صرف اس لئے کہ عربی

زبان کی شناخت ہے۔ میں تو آج تک عبدالرحمن وعبدالرحیم وغیرہ کو زبان عربی کے اسمائے معرفہ سمجھتا تھا۔ خواہ وہ کسی زبان کی عبارت میں تحریر ہوں۔ مگر اب معلوم ہوا۔ کہ نہیں جب عربی عبارت میں ہوں جبھی عربی ہیں۔ ورنہ جس زبان میں تحریر ہوں اسی زبان کے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بقول ایڈیٹر صاحب اردو زبان میں عبدالرحمان عربی کا لفظ نہیں بلکہ اُردو ہے۔ اور (ال) محض اس شناخت کے لئے لکھ دیا جاتا ہے۔ تاکہ یہ معلوم رہے کہ عربی سے اردو بنایا گیا ہے۔ اب عرض یہ ہے کہ شناخت کے لئے تو عین مہملہ اور حائے حُطّی ایک چھوڑ دو دو حروف مخصوصہ عربی موجود ہیں (ال) پر کیا خصوصیت ہے؟ مناسب تو یہ ہے کہ (ال) اُڑا کر اس کا املا (جو بولو۔ وہ لکھو) کے بموجب عبدالرحمان کی جگہ عبدرحمان مثل علاحدہ اور بلکہ وغیرہ کے فصیح الملک میں شروع کر دیا جائے اپنے مقولے کے برخلاف کتابت کیا ضرور ہے۔ ہاں خوب یاد آیا۔ اتنی بات اَور رہ گئی۔ کیا یہ اجازت ہے۔ کہ جس طرح اردو زبان میں عبدالرحمن اردو سمجھا گیا ہے اسی طرح ہم اس کو انگریزی عبارت میں دیکھ کر انگریزی اور سنسکرت میں سنسکرت اور لاتینی فرانسیسی۔ یونانی وغیرہ میں انہیں زبانوں کا لفظ خیال کریں۔ ایڈیٹر صاحب کی خاطر ایسا سمجھ لینا اَور بات ہے۔ لیکن اہل تحقیق کے نزدیک تو اس خیال کی وقعت خواب وخیال سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

چند الفاظ عربی عظمت۔ ذکر۔ ذریعہ۔ اضافہ۔ تعویذ۔ حرکت اور تحد وغیرہ جو ذرا (زرا) میں ذال ہونے کے استدلال میں مثلاً لکھے گئے ہیں۔ ان پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ جب زرا موّرد یا مستند ہے ہی نہیں۔ بلکہ خاص ہماری اردو زبان کا لفظ ہے۔ جیسا کہ اوپر ثابت ہو چکا۔ تو اڈیٹر صاحب کے یہ جملہ الفاظ کہ (ادھر تو ذرا میں مستند ہونے کی وجہ سے ذال کا اُڑانا پسند کیا جاتا ہے۔ اور ادھر ذرے کو حالت اضافت وترتیب میں ی سے لکھا جاتا ہے۔

اور وہاں اس تغیر کے سبب ذال سے کوئی اجنبیت نہیں ہوتی) اس کے جواب دہ
وہ اصحاب ہیں جو موردیا مہند ہونے کی وجہ سے ذرا (زرا) میں ذال کا اڑانا پسند
کرتے ہوں۔ اور لفظ ذرّے کو حالت اضافت و ترکیب میں یَ سے لکھتے ہوں
میرے نزدیک تو نہ ذرا (زرا) موردیا مہند ہے اور نہ لفظ ذرّہ کو حالت اضافت
و ترکیب میں ی سے لکھنا درست ہے۔ اور یہی خیال شاید وصل بلگرامی کا بھی
ہوگا۔ کیونکہ ان کے مضمون استفسار سے ذرا (زرا) کو ہندی زبان کا لفظ
سمجھنا مفہوم معلوم ہوتا ہے۔ نہ کہ موردیا مہند۔ اور لفظ ذرّہ کو حالت اضافت
و ترکیب میں ی سے لکھنے کا پتا بھی اُن کے مضمون میں کہیں نہیں لگتا پس
نہیں معلوم جناب اڈیٹر صاحب کا روئے سخن کس کی طرف ہے۔ ذرا (زرا) کو
مہند ہونے پر تو خود ہی بھرے ہوئے ہیں۔ اور حالت عطف و اضافت میں الفاظ
عربی و فارسی میں ہائے مختفیہ کی جگہ یَ لکھنے کا بھی حکم لگاتے ہیں۔ جیسا کہ
پہلے نمبر کے آغاز میں "جو بولو وہ لکھو" کے عنوان کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں۔
کہ (حالت اضافت و عطف میں بھی فارسی الفاظ اسی طرح لکھے جائیں گے جس
طرح بولے جاتے ہیں۔ جیسے لبِ و لہجے۔ اہل زبان) پس لب و لہجے کی طرح آفتاب
و ذرّے بھی ہے۔ اگر ذرا (زرا) سے ذال کا اڑانا بھی پسند فرماتے ہوتے۔ تو اپنی
تحریر مرقومہ بالا کے پورے پورے جواب دہ وہ خود ہی تھے + تاہم دوسرے فقرے
(ذرّے کو حالت اضافت و ترکیب الخ) پر تو پورا پورا عملدر آمد اڈیٹر صاحب ہی کا ثابت
ہے۔ اب کہئے روئے سخن کس کی طرف رہتا ہے +
اپنے جواب کے آخر میں جو حروف مخصوصہ تازی کو چند حروف ذیل کے ساتھ باہم
مترادف و ہم مخرج سمجھ کر اردو میں داخل کر لینے اور حروف ہجا میں ایک قسم کی
توسیع ہو جانے کی آسان تجویز فرمائی ہے۔ اس کی نسبت یہ عرض ہے کہ حروف ہجا

ہیں تو سب حروف عربیہ بوجہ شمول الفاظ عربی خود ہی شامل ہیں۔ اب توسیع کیا ہوگی
اور الف۔ع اور ہ۔ح اور ت۔ط اور س۔ص اور ز۔ذ۔ض کو باہم مترادف
سمجھنے کی کیا ضرورت ہے؟ حروف عربیہ الفاظ عربی میں مستعمل ہونگے۔ اردو کے
الفاظ میں الف کے ہوتے ع اور ہ کے ہوتے ح اور ت کے ہوتے ط اور س کے
ہوتے ث۔ص اور ز کے ہوتے ذ۔ض۔ظ کا مخرج تبدیل کرکے تحریر میں
لانا محض فضول ہے۔ اور اس سے یہ جو فائدہ تجویز کیا گیا ہے کہ عربی الفاظ کی اصلیت
یوں بھی نہ بگڑنے پائیگی جبکہ حروف عربیہ دیگر حروف مذکورہ بالا کے مترادف و
ہم مخرج نہ سمجھے جائیں محض الفاظ عربیہ کی اصلیت نہ بگڑنے ہی کی غرض سے
حروف عربیہ اردو اور فارسی کے حروف ہجا میں شامل کئے گئے ہیں۔ بلکہ اصل تو یہ ہے
کہ عربی الفاظ کی اصلیت اس حالت میں برقرار رہے گی۔ اور اڈیٹر صاحب کی تجویز کے
موافق تو بگڑ جائیگی۔ صرف دیکھنے کی صورت رہ جائیگی۔ اب جائے انصاف ہے۔ کہ
اس نئی تجویز سے کیا فائدہ ہوا + راقم حمد لکھنوی

اس مضمون پر اڈیٹر صاحب فصیح الملک کی رائے بھی ذیل میں لکھی جاتی ہے

یہ جناب حمد کی تحریر کا ترکی بہ ترکی جواب ہے :-

ولایت میں پارلیمنٹ کے ممبروں کا تقرر و انتخاب جس طرح پبلک کی عام
اور آزادانہ رایوں سے ہوتا ہے اس کی تھوڑی بہت شان ہندوستان کے اکثر
ضلعوں میں چنگی و میونسپلٹی کے انتخاب ممبران میں نظر آتی ہے۔ فرق اتنا ہے۔ کہ
یورپ میں بہت زیادہ حصہ ملکی حقوق کے واقفوں کی ذاتی اور آزادانہ رایوں کا ہوتا ہے
اور یہاں محض ناواقفوں اور غافلوں کی خوشامد اور کورانہ تقلید کا نتیجہ۔ انتخاب ممبری
کے وقت پرچے تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔ اور بعض خواص اور کثرت عوام الناس انکی
خانہ پری کرکے اپنے مجوزہ ممبروں کی خاطرداری کر دیتے ہیں۔ ورنہ درحقیقت ملکی حقوق

اور اصلی فرائض و خدمات پر نظر نہیں ڈالی جاتی +

یہی رنگ آج سال بھر سے فصیح الملک میں ذرا کی بحث کا نظر آرہا ہے اگر لوگوں سے کہہ سُنکر اپنے موافق مضامین لکھوا لینے سے کام چل سکتا ہو۔ اور وہ مفید بھی ہو۔ تو ہر شخص جان سکتا ہے۔ کہ مستفسر و مضمون نگاران فصیح الملک سے زیادہ اڈیٹر رسالہ ہماشما کی رائیں کسی نہ کسی ذریعہ سے منگا کر شایع کرسکتا ہے۔ مگر یہاں اس کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ فصیح الملک اس غرض سے شایع نہیں کیا گیا۔ کہ اڈیٹر اپنی قابلیت یا خواہی نخواہی اپنے اجتہاد کا جھنڈا میدان شہرت میں گاڑے۔ بلکہ وہ صرف اس لئے ہے۔ کہ ملک کے قابل قابل اہل قلم کے کارنامے اور ان کی مفید معلومات اس میں شایع ہوں۔ افسوس ہے کہ اب تک اس صاف اور سچے خیال کو بعض حضرات غلط سمجھے ہوئے ہیں۔ اور جانتے ہیں کہ رسالہ اڈیٹر کی ذاتی رایوں کا مجموعہ ہے۔ یہ خیال اس سے پہلے بھی بارہا ظاہر کیا گیا ہے اور پھر عرض کیا جاتا ہے۔ کہ براہ کرم کوئی صاحب فصیح الملک کی اس تحریر کو مختتم اور قطعی نہ سمجھیں۔ جو اڈیٹر کی طرف سے ہو۔ بلکہ وہ رائے صرف اس لئے ہوتی ہے۔ کہ اہل قلم اس سے اختلاف یا اتفاق کر کے کوئی بات طے فرمائیں۔ ذرا کی بحث میں جو کچھ اڈیٹر کی رائے تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً ظاہر کی گئی۔ اور اکثر حضرات نے بے لاگ اختلاف و اتفاق کیا۔ مگر اب دو چار ماہ سے مستفسر کے بعض احباب اس بات پر اُتر آئے ہیں۔ کہ یہ بحث ذاتی بحث بنا دی جائے۔ جس کا آخری نتیجہ یہ ہو۔ کہ فضول نزاع لفظی اور حجتوں سے دلوں میں کشیدگیاں پیدا ہوں +

یہ تین مضمون جو ذرا کی بحث میں لکھے گئے ہیں۔ مستفسر (وصل بلگرامی) کی معرفت دفتر فصیح الملک میں آئے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ مضامین انہیں حضرات کے لکھے ہوئے ہوں۔ جن کی طرف منسوب ہیں۔ لیکن ایسی مراسلات سے جو نتیجے ہو سکتے ہیں۔ وہ محتاج تشریح نہیں۔ محقق باکمال مکرمی حضرت جلال مدظلہ ایک

باخبر بزرگ ہیں۔ اور بے شک ان کی رائے ایک مجتہدانہ رائے مانی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ وہ زمانہ ہے۔ کہ بغیر کسی ثبوت و استدلال کے کوئی بات سنی نہیں جاتی۔ اس لئے حضرت موصوف کے ارشاد پر زیادہ خامہ فرسائی غیر ضروری ہے۔ کیونکہ اسمیں کچھ بھی نہیں۔ ہاں جناب حمد کی باریک بینیاں اور ذہانت قابل داد ہے۔ اس وقت اس طولانی نوٹ لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر مضمون نگار مذکور کی مکرر تحریروں نے بوجوہ مجبور کیا۔ لیکن قبل اس کے کہ ان کے مضمون کی بابت کچھ تحریر ہو۔ یہ اطلاع ضروری ہے کہ ذال کے اس دور تسلسل کا یہ آخری جام ہے۔ کیونکہ فصیح الملک کی انجمن جس لطف کے لئے قایم کی گئی ہے۔ اس میں وہی سرور حاصل ہونا چاہئے ایسی آپا دھاپی سے امید نہیں۔ کہ کوئی بے کیف ہوئے بغیر رہ سکے۔

پیوستہ گذشتہ نمبر میں جو مضمون جناب حمد کا شایع ہوا ہے۔ اس پر ہماری طرف سے نہایت مختصر اور ضروری نوٹ لکھا گیا تھا۔ جو مضمون نگار موصوف کی ناراضی کا باعث ہوا۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہیں اَلْحَقُّ مُرٌّ کا مفہوم بھی غلط ہوسکتا ہے۔ اس مضمون میں جو نکائے جانے کے بعد بزعم خود بہت کچھ ذرا کی تحقیق کی گئی ہے۔ پھر بھی موقع بے موقع زاید از بحث باتیں بھر دی گئی ہیں + مضمون کی طوالت اور فضول تکرار دیکھ کر اس مرتبہ اس کی اشاعت کا ارادہ نہ تھا۔ مگر خود بدولت کے اصرار نے (جو بالواسطہ تھا) مجبور کیا۔ اب ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ ذرا کی تحقیقات میں لفظ جہت۔د کی تفسیر و تنقید کی ضرورت کیا تھی۔ اور اگر ضرورت تھی تو اتنی طوالت سے کیا حاصل؟ اس پر یہ طرّہ ہے کہ خود اپنے دعوے پر قایم نہیں۔ اوّل اپنی طرف سے مولانا ذکاءاللہ صاحب اور اڈیٹر کے مشروط خیال (اگر ذرا ہندی ہوتا) کو قطعی اعتراض فرض کرکے فرماتے ہیں۔ کہ ہندی محاورۃً اردو زبان کو کہتے ہیں۔ پھر اسی اپنے مضمون میں بحث تشریح الفاظ فرماتے ہیں۔ کہ کبت بفتح اوّل

دکسر دوم (ہندی) ایک نظم ہندی کی قسم۔ سچ کہا ہے "جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے"
شاید کبت سے مراد اُردو نظم ہو۔ اس کے بعد کتابت کی بحث پر توجہ مبذول ہوتی
ہے۔ اور سر بن جن کے املا پر خشتی مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ معلوم نہیں کہ اگر سرِ سخن
کو سُر بن جن لکھا گیا۔ تو تلفظ میں وہ کون سی نئی آواز سرزد ہوئی۔ جس نے حضرت
کو اتنا پراگندہ کیا۔ غرض کہ اسی قسم کی باتیں جملہ تحفہ کی طرح سطر سطر کے بعد موجود ہیں۔
یہ کج بحثی اور نزاع لفظی نہیں تو کیا ہے؟

جناب ممدوح کے گمان میں لفظ ذرا خدا جانے کوئی منقولہ جائداد ہے یا منصوص
من اللہ فرمان۔ جس پر اتنا شور مچایا جاتا ہے۔ اگر وہ ذال سے لکھا گیا۔ تو آپ کا کیا
بگڑ گیا۔ اور زے سے تحریر ہوا۔ تو آپ کو کیا مل جائے گا۔ مباحثے کا پیرایہ ایسا ہونا چاہیئے
جس میں اصل مطلب کے سوا تُو تُو۔ مَیں مَیں۔ اور نفسانیت کا شائبہ تک نہ ہو۔
دیکھئے اسی بحث میں مولانا ذکاء اللہ صاحب وحضرت شہیر وغیرہ نے کن الفاظ میں
کیا کچھ نہیں لکھا۔ آپ ہیں کہ بقول اپنے ہریل کی لکڑی پکڑے بیٹھے ہیں۔

لفظ ہندی کو مفید معنی اُردو قرار دے کر ثبوت میں لفظ ہند پیش کرنا عجیب
وغریب دلیل ہے۔ اور پھر تائید کلام کے لئے موتر دکا ایجاد مزید برآں۔ حضرت ہند
اور ہندی میں بڑا نازک فرق ہے۔ ہندی کے لفظی معنے میں صرف اردو ہی نہیں۔ بلکہ
تمام وہ زبانیں جو ہندوستان میں رائج ہوں۔ شامل ہو سکتی ہیں۔ اور یہی مفہوم ہند
کا ہو سکتا ہے۔ لیکن لفظ ہندی کے جس معنے کی یہاں بحث ہے اس کا مفہوم
عام نہیں ہے۔ بلکہ اس ہندی سے صرف زبان بھاشا پراکرت مراد ہے۔ اور اس کے
ثبوت میں ہند پیش کرنا اور اپنے بچاؤ کے لئے موترو پیدا کرنا چوتڑ سے کان گانٹھنا
ہے۔ اگر اسی طرح تفریق لسان کے اظہار کی خاص ضرورت رہی تو کیا عجب ہے کہ
آئندہ مضامین دہلی کے محاورات کو مدل اور لکھنؤ کے مصطلحات کو ملکھن لکھا جائے

یہاں خواہ مخواہ کسی کو یہ اصرار نہیں۔ کہ ذرا ذرّے ہی سے بنایا گیا ہے۔ ممکن ہے۔ کہ برساتی کیڑوں کی طرح لشکر اردو کی گرد سے ظاہر ہوا ہو۔ مگر جہاں تک ظاہری قیاسات اور قدیمی اتفاق کتابت پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ تو یہی آسان بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ ذرا ذرّے سے لے لیا گیا ہے۔ خود جناب حما نے اپنی بحث میں حضرت تجر و صبا کے اشعار لکھ کر ثابت کر دیا ہے۔ کہ محققین شعراء اس لفظ کو اس ترکیب سے بھی کہہ گئے ہیں۔ کہ اس میں زائے ہوز کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ یہ کہنا۔ کہ متاخرین نے متروک کر دیا ہے۔ بڑے دھوکے کی ٹٹی ہے۔ کیونکہ متروک ذرّے کا تلفظ ہوا ہے نہ ذرا کی کتابت۔ جناب تجر و صبا ایسے پرانے لوگ نہیں تھے۔ جن پر متقدمین کا اطلاق ہو۔ بلکہ یہ حضرات متاخرین کے قرن اولے میں شامل ہیں۔ کیونکہ حضرت امیر و جلال و داغ کا ابتدائی زمانہ اور ان کا آخر زمانہ ایک ہے۔ کتابت کے لئے عادت قدیمہ کا لحاظ ضروری اور نہایت ضروری ہے۔ ورنہ اس سہل پسند زمانے میں اردو کتابت کی کیا کچھ کایا پلٹ نہ ہو جاتی۔

کتابت قدیمہ کے سوا دوسرا ثبوت یا قیاس ذرّے سے ذرا کے بننے کا یہ ہے کہ جو الفاظ معرب و مفرس یا ممد ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اصل سے ملتے جلتے ہوتے ہیں ساتھ ہی اس کے بقول جناب حما۔ یہ صحیح خیال ہے۔ کہ بہت سے الفاظ ایسے بھی ہیں۔ جو نہ معرب ہیں نہ مفرس مگر متحد الصوت ہیں۔ لیکن یہ امر لازمی ہے۔ کہ ہر متفق الصوت لفظ مفرس و معرب ہوگا۔ کیا کوئی صاحب ایسا لفظ پیش کر سکتے ہیں جو معرب و مفرس ہو اور متحد الصوت نہ ہو۔ یہ بات دوسری ہے کہ اہل عرب (پ) کی جگہ (ف) اور (ت) کی جگہ (ط) اور فارس والے ص کی جگہ س وغیرہ داخل کریں۔ تیسرا خیال اور منصفانہ قیاس ذرا میں ذال ہونے کا یہ ہے۔ کہ خاص اردو میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں۔ جن میں عربی کے حروف مخصوص شامل ہیں

اور برابر لکھے جاتے ہیں۔ جن پر ذرا بھی توجہ نہیں کی جاتی۔ ذال تو عربی کا مخصوص حرف بھی نہیں ہے +

ناظرین نے جناب حمد کے بالائی مضمون میں ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ کہ الفاظ عربی عظمت۔ ذکر۔ ذریعہ وغیرہ کا تذکرہ کس بے پروائی سے کیا گیا ہے۔ اور اپنے خیال میں کس خوبصورتی سے وہ الزام اپنے اوپر سے ہٹایا گیا ہے۔ حالانکہ یہی جگہ پانی مرنے کی ہے۔ اور یہیں سے مضمون نگار کے پاس سخن کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ذرا میں (ز) صرف اس وجہ سے لکھتے ہیں کہ وہ اردو کا لفظ ہے۔ پھر کیا وجہ کہ محرم میں حاے حطی۔ علیک سلیک میں (ع) صاحب بہادر۔ صافی صحنک۔ صدر بورڈ وغیرہ میں (ص) طرارے۔ طبلچی۔ طعنے مہنے۔ طوایف وغیرہ میں (ط) حاضری۔ حربے ضربے میں (ح۔ ض) ذات پات۔ ذائقہ۔ ذوق۔ ذیل۔ ذلیل میں (ذ) لکھی جاتی ہے۔ کیا یہ اردو کے الفاظ نہیں۔ کیا ان الفاظ کے بعض معنے اردو کے لئے مخصوص نہیں۔ کیا یہ معنی عربی میں بھی مستعمل ہیں۔ کیا یہ الفاظ ھند ہیں؟ میرے خیال میں اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ کہ ان کی کتابت اسی طرح ہوتی چلی آئی ہے۔ اور یُہیں ہوتی چلی جائیگی۔ شاید کسی صاحب کو یہ شبہ ہو۔ کہ الفاظ مذکور اصل میں عربی ہیں۔ اردو میں صرف معنوی اختلاف ہے۔ جس کے سبب سے کتابت نہیں بدل سکتی۔ اس کے جواب دو ہیں۔ اول یہ کہ ہند و مفرس ہوگیا۔ تو بخیال جناب حمد انہیں حروف مخصوص سے لکھنا چاہئے۔ جو اس زبان کے لئے ہیں + دوسرا جواب وہی ہے جو جناب حمد بالائی مضمون میں لکھ چکے ہیں۔ کہ اکثر الفاظ تو ایسے ہیں۔ جو بجنسہ مختلف زبانوں میں بمعنے مختلف موجود ہیں۔ مثلاً سخرہ۔ تماشیر۔ میل وغیرہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محرم۔ طوایف۔ صندلی۔ ذیل۔ ذات وغیرہ الفاظ

اگرچہ عربی میں بھی بولے جاتے ہیں۔ مگر با ختلاف معنی اردو میں بھی مستعمل ہیں۔
اور ایسی حالت میں وہ اردو کے الفاظ کہے جائیں گے۔ نہ غیر اردو +

(مجھے نہایت تعجب ہے کہ معمولی اور صاف صاف تحریر کے معنے کس پیچیدگی
سے پہنائے جاتے ہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ مولانا ذکاءاللہ صاحب نے ذرا کو
ہندی بتا کر (ذرا) کب کہا۔ وہ تو یہ کہتے ہیں۔ کہ "اگر ہندی ہوتا تو ذرا ہوتا" اس سے
ذرا کا ہندی ہونا ثابت ہے یا غیر ہندی۔ وہ تو ایک شبہ ظاہر کرتے ہیں۔ نہ کہ قطعی
امر۔ اسی طرح ہائے مختفیہ کی بحث میں عجیب خامہ فرسائی ہوئی ہے۔ اور بزعم خود لاجواب
بات سمجھی گئی ہے + میں نے اردو زبان کو بے شک تمام زبانوں کا مجموعہ بنایا ہے
لیکن تمام زبانوں کے قواعد کا مجموعہ نہیں کہا ہے۔ ہائے مختفیہ کا ہونا نہ ہونا قواعد
کتابت و تلفظ سے متعلق ہے نہ محض زبان سے + میرا یہ کہنا حسب قاعدہ مقررہ
دہلی بالکل صحیح ہے۔ کہ اردو میں ہائے مختفی کا وجود نہیں۔ یعنی اردو یا ہندی (بھاشا)
میں یہ حرف نہیں۔ نفی کے لئے اثبات کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی صاحب از روئے
قاعدہ ثابت کر دیں۔ تو دوسری بات ہے۔ یا خلاف قاعدہ کتابت کریں تو ان کی خوشی
ایسی حالت میں جب کہ ذرّہ نہ رہ کے ذرا ہو گیا۔ تو یہ لفظ اردو کا مانا جائے گا۔
اور یقینی الف سے لکھا جائے گا جیسے آرہ سے آرا۔ البتہ جو حروف فارسی وغیرہ
اردو میں اپنی اصل حالت پر لکھے جائیں گے۔ ان میں اسی زبان کے قاعدے
پر ہائے مختفی لکھی جائیگی۔ جیسے اغیرہ وغیرہ فافہم و تدبر +

اب یہ نوٹ ختم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ لفظاً لفظاً جواب دینے کی گنجائش نہیں
نہ اس کی ضرورت۔ اگر جناب حمد یا کوئی اور صاحب آئندہ اس باب میں کچھ تحریر
فرمائیں۔ تو فضول نزاع لفظی اور زائد باتیں چھوڑ دیں۔ ورنہ میرے نزدیک
ذرا کی بابت یہ فیصلہ مان لینا چاہئے۔ کہ اس لفظ کی کتابت مختلف فیہ ہے

اور درحقیقت اس تصفیہ کے سوا کسی طرح بلیسوئی کی امید نہیں +

رسالہ گلچین لکھنؤ کے اڈیٹر صاحب نے بھی اس پر مختصر سا ریمارک کیا ہے جو بغرض آگاہی ناظرین ذیل میں درج کیا جاتا ہے +

"فصیح الملک کا اردو پر احسان ہے کہ وہ تحقیق و تدقیق سے زبان کو فایدہ پہنچانا چاہتا ہے۔ اس کے پچھلے نمبروں میں اس امر کے متعلق بحث تھی۔ کہ زرا کا صحیح املا (ز) سے ہے یا (ذ) سے + اس مرتبہ اس کے تازہ نمبر میں یہ بحث ختم کر دی گئی ہے + حمد لکھنوی نے ایک طولانی مضمون لکھا جس کے بعض حصے اور طرز بحث پسندیدہ نہیں کہی جا سکتی۔ منشی امیر احمد صاحب ہمیشہ زرا کو (ز) سے لکھا کرتے تھے۔ مگر جب یہ کہا گیا۔ کہ ذرا اصل میں ذرہ تھا۔ اس کو (ز) سے لکھا جانا غیر صحیح نہیں ہے۔ منشی صاحب نے اس کے خلاف بحث زیادہ پسند نہیں کی۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ذرا در اصل ذرہ تھا۔ تو بھی ضرور نہیں کہ اس کا املا (ذ) سے رہے۔ اور اگر اصرار ہے کہ ذال ہی سے لکھا جائے تو اس خیال والے اپنی ہٹ پر قائم رہیں + سید ضامن علی صاحب جلال نے اس کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے وہی خیال منشی امیر احمد صاحب کا بھی تھا۔..... عشرت شاگرد شاد مرحوم نے بھی اسی خیال کی تائید کی ہے۔ کہ گو ذرا بہ فرض اصل میں ذرہ ہو تو بھی (ز) سے لکھنا صحیح ہے۔ کیونکہ ہم نے تمام اردو الفاظ میں (ذ) کا استعمال نہیں کیا ہے۔ ممکن ہے کہ کم تعداد کے لوگ زرا کا املا (ذ) ہی سے صحیح سمجھیں مگر کثرت رائے اس کے خلاف ہے اور مستند رائیں اس کے موافق ہیں۔ کہ زرا کا املا (ز) سے صحیح ہے"

معلوم نہیں وہ کونسے مستند اہل الرائے ہیں جنکی رائے عام لوگوں کیلئے قابل تسلیم ہے۔ ہم کو تو صرف جناب جلال لکھنوی کی رائے توجہ کے لایق معلوم ہوتی

ہے۔ منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی کا ارشاد بھی واجب التسلیم ہے مگر
افسوس ان کی رائے اس معاملہ میں مذبذب تھی۔ وہ زرا کے حامی تھے نہ ذرا کے مخالف
اس کے متعلق فصیح الملک میں مفصل لکھا جا چکا ہے۔ اب اہل دہلی و لکھنؤ کے
دلایل پر خیال کرنا چاہئے۔ پہلے تو صاحبان لکھنو کا یہ اعتراض تھا۔ کہ (ذ)
فارسی کا حرف ہی نہیں۔ اس لئے یہ اردو میں کیوں آئے۔ مگر جب یہ ثابت کر دیا
گیا تو پھر بھی وہی مرغے کی ایک ٹانگ ہی رہی۔ جو لوگ ذرا کو (ز) سے لکھنا
پسند کرتے ہیں۔ میرے نزدیک ان کا پلا ذرا والوں سے ذرا ہلکا ہے۔ کیونکہ زبان
دہلی کے مقلدین میں ایسا کوئی شخص اب تک نہیں دیکھا گیا۔ جو اس لفظ کا املا (ز)
سے پسند کرتا ہو۔ مگر برخلاف اس کے بعض اہل لکھنؤ ذرا کے حامی اور زرا کے
مخالف پائے جاتے ہیں۔ منشی احمد علی صاحب شوق لکھنوی سابق اڈیٹر اخبار
"آزاد" کا نام نامی پبلک میں خصوصیت سے مشہور ہے۔ ان کا ایک مضمون اس
بحث کے متعلق اودھ پنچ میں شایع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے ذرا کی سخت
مخالفت کی تھی۔ قطع نظر اس کے مولوی ظہیر احسن صاحب شوق نیموی جن کی
تحقیق کا زمانہ قایل ہے۔ اور جو حضرت جلال لکھنوی سے زبان کے معاملے میں
بہت کچھ بحث کر چکے ہیں۔ اپنی ایک کتاب میں ذرا کے متعلق یوں تحریر
فرماتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ لفظ ہندی الاصل نہیں بلکہ معرب ہے اسکی
اصل ذرّہ ہے۔ رائے مشددہ کو مخفف کر کے ہائے مختفیہ کو الف
سے بدل دیا ہے۔ معرب الفاظ میں تو حروف عربیہ کے ہونے سے
کسی کو انکار نہیں۔

جناب شوق حضرت تسلیم لکھنوی کے شاگرد تھے۔ اور اس خیال سے

ہیں ان کی رائے کو بھی کسی اہل لکھنؤ کی رائے سے کم نہیں سمجھتا۔ اس صورت میں بھی جو لوگ ذرا پڑھے ہوئے ہیں۔ ان کا خیال محض حسن عقیدت سے متعلق ہے۔ ورنہ ذرا والوں کو نمایاں کامیابی ہو چکی ہے۔

زَردا۔ زرد رنگ کے میٹھے چاول جو ہلدی اور زعفران ڈال کر پکائے جاتے ہیں۔ اہل دہلی اپنے محاورے میں کھانے کے تمباکو کو بھی زردا کہتے ہیں۔ لکھنؤ میں زردا کوئی نہیں کہتا۔ پروفیسر مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی مولف آب حیات نے ایک جگہ لکھا ہے۔ کہ اہل لکھنؤ پینے کا ہو تو تماکو۔ پان میں کھانے کا ہو تو تمباکو کہتے ہیں۔ دلی والے پینے کا ہو تو تمباکو۔ کھانے کا ہو۔ تو زردا کہتے ہیں۔ مگر لکھنؤ کی نسبت پروفیسر آزاد نے جو خیال ظاہر کیا ہے وہ شاید کبھی پہلے زمانے سے متعلق ہوگا۔ ورنہ اب تو کھانے اور پینے کے تمباکو کا فرق الفاظ خوردنی و نوشیدنی سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

زُنّار۔ یہ لفظ لکھنؤ میں مونث بولا جاتا ہے۔ ؎

اہتی ہے حسن پرستوں کے گلے میں زنجیر کفر انکا ہی نیا اور ہے زُنّار نئی۔ (ناسخ لکھنوی)

بیخود ہے تیری راہ میں تجھ شیخ و برہمن۔ تسبیح گر پڑی کہیں زُنّار گر پڑی (رشک لکھنوی)

بعض اہل لکھنؤ نے مذکر بھی باندھا ہے۔ مگر جلال اپنے رسالہ تذکیر و تانیث میں لکھتے ہیں کہ زُنّار ضد ہے تسبیح کی۔ پس مانند تسبیح مونث ہی چاہئے۔ اب اس کے متعلق یہ قطعی تصفیہ سمجھنا چاہئے۔ کہ اس لفظ کو اہل لکھنؤ مونث اور اہل دہلی مذکر استعمال کرتے ہیں ؎

چشم ساقی نے میخانے میں پھیلایا کفر گردن شیشہ میں زُنّار نظر آتا ہے (ذوق دہلوی)

زنجیر کے ٹکڑے اڑانا۔ اس لفظ کے متعلق صاحب فرہنگ آصفیہ نے لکھا ہے۔ کہ اہل دہلی بھول کر بھی نہیں بولتے۔ کیونکہ لوہا ایک ایسا کثیف اور

ثقیل جسم ہے۔ کہ جس کے لئے اُڑنا کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتا۔ ؎ (آباد لکھنؤ

اُڑگئی زنجیر ٹکڑے پُرزے سب غل ہوگیا — تیری طاقت کا لبِ آ دستِ جنوں غل ہوگیا

غل بنے طوق آہنی آباد لکھنوی کے سوا دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آیا
اگر شاعرانہ مبالغے پر خیال کیا جائے۔ تو آباد لکھنوی کا شعر چنداں قابلِ اعتراض
نہیں رہتا۔ کیونکہ قدیم شاعری میں اکثر باتیں اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب
باتیں پائی جاتی ہیں۔ پھر صرف بیچارے آباد کو ہدف بنانا ٹھیک نہیں ٭

حرفِ س

سارنگ۔ شہد کی مکھی۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے ؎ (دبیر لکھنوی)

دل اس کی زلف میں اُلجھا مہر سر کھیرا — آئی الاماں سارنگ کے چھتے کو چھیڑا ہے

اہلِ دہلی سارنگ کا چھتا چھیڑنا نہیں بولتے۔ اُن کے نزدیک یہ محاورہ [illegible]
صحیح و درست ہے۔ ؎

ہم میں کھیرے ہیں آج انکو بیٹھے تھے رقیب — بھڑ کا چھتا چھیڑ کر شامت ہماری آگئی (داغ

ساری۔ [illegible]۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔ اہلِ دہلی [illegible] کہتے ہیں
سازش۔ اس لفظ کو پہلے سب شعرائے دہلی و لکھنؤ مونث باندھتے تھے
مگر اب اہلِ دہلی مذکر استعمال کرتے ہیں۔ مرزا غالب نے اردوئے معلّٰی میں۔ پروفیسر
آزاد نے آبِ حیات میں۔ فصیح الملک مرحوم نے گلزارِ داغ میں اس کو مذکر لکھا
ہے۔ اور صاحب فرہنگ آصفیہ نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے ٭
سخن تکیہ۔ کسی لفظ کا اس طرح زبان پر چڑھ جانا کہ موقع بے موقع ہر ایک بات
کے درمیان لایا جائے۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے ؎

واہ کیا پیرِ مغاں کا ہے تصرف میکشو! — محتسب کا اب سخن تکیہ ہی مُل مُل ہوگیا (ناسخ لکھنؤ)

ناتوانی کب فقط ہے میرے جسم زار میں ۔ ہے سخن تکیہ پہ تکیہ بات کو گفتار میں (ماہر لکھنوی)

جب یہ لفظ اہل لکھنؤ نے ایجاد کیا تو مرزا غالب نے طنزاً یہ شعر لکھا تھا ؎

روا رکھو نہ رکھو ہے جو لفظ تکیہ کلام ۔ اب اس کو کہتے ہیں اہل سخن سخن تکیہ

یہ لفظ دلی میں رائج نہیں وہاں کے لوگ تکیہ کلام کہتے ہیں ؎

اس روئے شعلہ تاب کا کچھ سن لیا ہو وصف ۔ تکیہ کلام وہ کلیم ہے کلیم کا (صابر دہلوی)

پہلے تو نہیں نہیں سنی تھی ۔ اب تکیہ کلام ہو گئی ہے ۔ (داغ دہلوی)

سراسری۔ روا روی ۔ کسی چیز کو بے توجہی اور ایک نظر سے دیکھنا لکھنؤ میں عام طور سے بولا جاتا ہے ؎

پڑے وہ پیچ نہ مجھ پر کہ ایک بلا میں پھنسوں ۔ تمہاری زلف کا سودا سراسری ہو جائے (امانت لکھنوی)

دل کا دینا سراسری مست جان ۔ جان پر کھیلنا سراسر ہے (نسیم لکھنوی)

دلی میں سرسری بولا جاتا ہے ۔ ؎

سرسری ہم جہان سے گذرے ۔ ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا (میر تقی دہلوی)

مثل سحاب باندھے جا کر ہوا فلک پر ۔ جس پر کہ اسکی چشم الطاف سرسری ہو (ذوق دہلوی)

مجھ سے بگڑے وہ سن کے شکر جفا ۔ بڑھ گئی بات سرسری ہو کر (داغ دہلوی)

سرمکھ ہونا ۔ مقابل ہونا ۔ سامنے ہونا ۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے ؎

اس کے ابرو سے جو سرمکھ ہو ہلال ۔ پھینک دے تلوار لوہا مان کر (بحر لکھنوی)

اہل دہلی سنمکھ بولتے ہیں ۔ صاحب فرہنگ آصفیہ نے اس کی نسبت خیال ظاہر کیا ہے ۔ کہ یہ لفظ اصل میں سنمکھ ہی درست ہے ۔ صاحبان لکھنؤ نے اصلاح دیگر سخن کو سر خیال فرمایا ہے ۔ یعنی سر اور مکھ سے مرکب مانا ہے ۔ مگر یہ ٹھیک نہیں کیونکہ ہندی اور سنسکرت میں حرف سن معیت کیواسطے آتا ہے جیسے فارسی میں حرف با ؎

گل اگر سنکھ ہو بعضے بھید کچھ کہہ گئے   بلبلو کتنے ہی غنچے رازِ دل نہ کر گئے (درد دہلوی)
نگاہ شرمگیں نے مجھ کو مارا ہے میں دیکھو ہوں   اگر سنکھ ہو تم آنکھیں لڑاؤ گے تو کیا ہوگا (جرات دہلوی)

سنائی - موت کی خبر جو کہیں باہر سے آئے ٭

انتظار خط میں پہلے خط سے ہیں نئے جاندی   نامہ بر آیا تو وہ لیکر سنائی پھر گیا (برق لکھنوی)
پر اپنے نوشتے سے یہ خطرہ ہو کہ واں سے   تیری نہ سنائی کہیں اے نامہ بر آوی (جرات دہلوی)

صاحب فرہنگ آصفیہ لکھتے ہیں کہ اب دِلّی والے سناونی بولتے ہیں۔

سوگی - غمگین - ملول - اہل لکھنؤ ابرک کی ٹٹیوں اور اُس آرایش کو بھی کہتے ہیں جو ہنڈوں میں بیاہ کے ساتھ جاتی ہے +

سنک - دیوانگی - خبط - لکھنؤ میں بولا جاتا ہے - جناب جلال نے لکھا ہے -

سُنکر - لکھنؤ میں میوہ فروش کو کہتے ہیں - دلّی میں مستعمل نہیں ٭

گھر سے تو میوہ فروشوں کو اگر دیتا صدا   غیر سُنکر کی طرح آواز سُن کر بولتے (امانت لکھنوی)

سونچنا - جلال لکھتے ہیں - کہ نون غنہ کے ساتھ اندیشیدن کا ترجمہ ہے - لوگ جو اس کو بدون نون غنہ کے پڑھتے یا لکھتے ہیں - مولف کے نزدیک غلط ہے ٭

جا کے بتخانے میں ناقوس بنا شکر خدا   خوب سونچا بہت اچھی دل ناداں سمجھا (جلال لکھنوی)

دِلّی والے بغیر نون بولتے ہیں - اور سوچنا کہتے ہیں +

سہانا سایہ ڈھلنا - جھٹ پٹے کا وقت ہونا - سرِ شام - اہل لکھنؤ کا محاورہ ہے - مگر اچھا محاورہ ہے +

حرف ش -

شر - جھگڑا - فساد - عموماً مذکر بولا جاتا ہے - مگر دلّی میں بعض آدمی مونث بھی کہتے ہیں + ٭

لڑائی کا دھیان آن سے صابر نہ تھا۔ مگر باتوں باتوں میں شر ہو گئی۔ (صابر دہلوی)

شرابور۔ پانی میں یا کسی اور رقیق چیز میں سر سے پاؤں تک تر ہونا۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔ ؎

خم سے برسات میں اس درجہ ہوا جوش شراب ہو گئی بادۂ گلگوں سے شرابور گھٹا (ناسخ دہلوی)

اہل دہلی شور بور بولتے ہیں ؎

آج تیری گلی سے ظالم! میر لہو میں شور بور آتا ہے (میر تقی دہلوی)

ہولی کھیلی ہے تم نے کس سے آج رنگ میں شور بور آئے ہو (داغ دہلوی)

شگوفہ دکھانا۔ بلا میں پھنسانا۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔ ؎

تخم الفت نے شگوفہ یہ دکھایا مجھ کو دشتِ پرخار کے کانٹوں پہ لٹایا مجھ کو (سحر لکھنوی)

حرف ص

صحن۔ آنگن۔ چوک۔ لکھنؤ میں ایک قسم کے عمدہ ریشمی کپڑے کو بھی کہتے ہیں۔

حرف ط

طرز۔ پہلے یہ لفظ لکھنؤ میں مونث بھی بولا جاتا تھا۔

زلف کی مانند کنگن نے ترے بیداد کی۔ طرز ہے شاگرد میں بھی ٹھیک استاد کی (امیر لکھنوی)

ہمارے نالہائے پر اثر کی طرز اڑائی ہے۔ گریباں چاک ہو گل کا نہ کیوں بلبل کے شیون پر

ہر نالے میں سو ٹکڑے جگر ہوتا ہے بلبل۔ آسان نہیں طرز اڑانی میرے دل کی۔

طرز اڑائی ہے ہمارے نالۂ دلدوز کی۔ چھید پڑ جائے نہ کیوں منقار موسیقار میں

(ناسخ لکھنوی)

اب بعض حضرات لکھنؤ طرز کو مذکر بھی لکھتے ہیں۔ البتہ جناب جلال اسکی تذکیر کے خلاف ہیں۔ فصیح الملک داغ مرحوم مونث ہی کہتے تھے۔ ؎

نہیں ملتا کسی مضموں میں ہمارا مضموں ۔ طرز اپنی ہے جُدا سب سے جدا کہتے ہیں
داغ معجز بیاں ہے کیا کہنا ۔ طرز سب سے جدا نکالی ہے (دا)

حرف ع

عرش پر جھولنا۔ کمال رفعت۔ بلندی و علو جاہ و مرتبت حاصل ہونے سے ہے۔ لکھنؤ میں بولتے ہیں۔ جیسے ان کی تلوار عرش پر جھول رہی ہے سہ

ان روزوں بانکپن ہے زیادہ مزاج میں ۔ عرش بریں پہ جھول رہی ہے حسام دوست (رنا)

عقل کا چراغ گل ہو جانا۔ عقل زائل ہو جانا۔ لکھنؤ کا محاورہ ہے +

عمر تیر کرنا۔ لکھنؤ میں اسی طرح بولا جاتا ہے۔ اہل دہلی عمر ٹیر کرنا بولتے ہیں فرہنگ آصفیہ لکھتے ہیں۔ کہ تیر کی کوئی نسبت نہیں پائی جاتی۔ اور ٹیر کرنا ٹالنا لیا گیا ہے۔ یعنی ٹال کا ٹیل ہوا۔ اور ٹیل سے حسب قاعدہ ٹیر ہوا۔ کیونکہ لام رے کا بدل ہے۔ اُس سے ٹیر کرنا بنا لیا +

حرف غ

غش لانا۔ بیہوش ہونا۔ لکھنؤ میں مستعمل ہے سہ

محفل سے اُٹھانے کا جب قصد کیا اُسنے ۔ دانستہ میں غش لایا تو بولے کہتے ہیں (ناسخ)

حرف ف

فاتحہ۔ یہ لفظ لکھنؤ میں مذکر بولا جاتا ہے سہ

فاتحہ تھا کس شہید عشق کا ۔ رات بھر درگاہ میں ماتم رہا (ہجر لکھنو)

چادر گل کی میں امید رکھوں تجھسے کیا ۔ فاتحہ تک تو نہ مرقد پہ پڑھا میرے بعد (رند لکھنو)

اہل دہلی مونث بولتے ہیں ؎

لاش دفنا کر مری بیٹھا ہے قاتل سوچیں — یعنی میری فاتحہ کا کونسا وہ دن کرے (ذوق دہلوی)

مراہی دل نہ ہوئیں ہی نہ ہوں کے امر گرما بوسی — خدا جانے یہ کسکی فاتحہ ہے آج یاروں میں (داغ دہلوی)

عدو پڑھتے ہیں سبھی حضرت داغ — پڑھو اب فاتحہ تم اپنے دم کی۔ (داغ دہلوی)

فتح پیچ ۔ عورتوں کی چوٹی کے گندھے ہوئے بالوں کے اک پیچ کا نام ہے ۔ لکھنؤ میں رائج ہے ؎

جوبنا کی جو تیرے ہاتھوں گئی گل ضرب دست کھا — چوٹی کے فتح پیچ سے سنبل شکست کھا گئے (آتش لکھنوی)

جتنا ادھر کھنچا تری چوٹی کا فتح پیچ۔ — بڑھتی گئی ادھر بھی شکست کلاہ شوق (امیر مینائی)

فقرہ ہونا ۔ رفو چکر ہونا ۔ ہوا ہونا ۔ یہ نیا محاورہ حال میں لکھنؤ سے ایجاد ہوا ہے

فکر ۔ اس لفظ کی مختلف صورتیں حسب ذیل ہیں :۔

قرار آہی گیا غم میں جی سنبھل ہی گیا — گئے وہ دن کہ جو تھا فکر جان جانیکا
فکر ہے انکو متاع حسن کے نیلام کی۔ — سر ہو چھوٹے اگر بولی ہماری نام کی } (اسیر لکھنوی)

گر چھڑانا ہے تجھے پیارا دل رنجور کا۔ — پہلے کر لو فکر آسے جراح آنشگیر کی۔ (ناسخ لکھنوی)

[illegible] خورشید — [illegible] (… لکھنوی)

گزر جائیگی ہر صورت کرو کیوں داغ اندیشہ — مرے مولا کو ہر دم فکر ہے میرے گذاری کا (داغ دہلوی)

ثنائے حق میں دلکو فکر تھا مضمون نگاری کا — قلم خود مصرع برجستہ نکلا حمد باری کا۔ (راسخ دہلوی)

اب اس لفظ کے استعمال میں یہ فرق ہے ۔ کہ دہلی میں مذکر و مونث دونوں طرح بولا جاتا ہے ۔ اور لکھنؤ میں صرف مونث +

حرف ق

قامت ۔ جناب جلال فرماتے ہیں کہ فی زمانہ اکثر متاخرین قامت کی تانیث

ہی کے قایل ہیں۔ اور مولف کے عندیہ میں بھی مونث ہے" ہم نہیں سمجھ سکتے جناب جلال قامت کو کس خیال سے مونث فرماتے ہیں اور اس میں تانیث کی کونسی شان پائی جاتی ہے۔ بہرحال انہیں اپنی رائے ظاہر کرنیکا اختیار ہے۔ مگر بعض اہل لکھنؤ اور اکثر اہل دہلی اس کی تذکیر ہی کے قایل ہیں + سے

اُس کا قامت دیکھکر سب کٹ گئے۔ بڑھ چلے تھے سرو بھی شمشاد بھی۔
قامت موزوں قیامت ہے ترا کیا ہے گر سرو و صنوبر بڑھ چلے (داغ دہلوی)

قہاقا۔ کھل کھلا کر ہنسنا۔ لکھنؤ میں قہاقا اور قہقہہ دونوں طرح بولا جاتا ہے سے
مسکرایا جو نظر آئے دہن غنچوں کے کبک کی چال جو دیکھی تو قہاقا مارا (برق لکھنوی)

حرف ک

کان اینٹھنا۔ گوشمالی دینا۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے مصرع ناسخ ۔
طنبور کی طرح گو اُمیٹھے گئے کان +

کانٹوں پر کھینچنا۔ شرمندہ کرنا۔ تکلیف دینا۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے سے
چشم [illegible] اُس گلی سے کانٹوں پر اس کو کھینچتا ہوں۔
ملا ایک مرکر تن سے بال کھینچتے ہیں کہ کانٹوں پر آب واں کھینچتے ہیں۔ (امانت لکھنوی)

اہل دہلی کانٹوں میں کھینچنا بولتے ہیں سے
ہے تن میں ریشہ ہائے [illegible] استخواں کیوں کھینچتا ہے کانٹوں میں اے ضعف تن مجھے (ذوق دہلوی)

کانٹوں پر گھسیٹنا۔ یہ بھی لکھنؤ میں مستعمل ہے سے
حسن روز افزوں نے کانٹوں پر گھسیٹا یار کو سبزۂ عارض بڑھا ایسا کہ جنگل ہو گیا (امانت لکھنوی)

اہل دہلی کانٹوں میں گھسیٹنا بولتے ہیں سے
ہر قدم پاؤں پہ سر رکھتے ہیں خار سر دشت اے جنوں تو نے تو کانٹوں میں گھسیٹا ہم کو (ذوق دہلوی)

کاندھا۔ دوش۔ کندھا۔ مونڈھا۔ لکھنؤ میں خواص بھی کاندھا ہی بولتے ہیں۔
چنانچہ اس کے متعلق چند مشتقات لکھے جاتے ہیں:۔
کاندھا بدلنا۔ کندھا بدلنا۔ ایک دوش سے دوسرے دوش پر کسی کا بوجھ لینا +
کاندھا دینا۔ جنازے کو دوش پر رکھنا۔ کندھا دینا ؂

کاندھا مرے جنازے کو کیا دو وہ نازنیں بھاری ہے جسکو زلف سیہ فام دوش پر (آتش لکھنوی)
دیا کاندھا جنازے کو جو میرے اُس پریرو نے گماں تھا تختہ تابوت پر تخت سلیماں کا (ناسخ لکھنوی)
جز مسیحا نہ کسی سے میرا مُردہ اُٹھتا اُس نے کاندھا دیا آکر جو جنازہ اُٹھا (رند لکھنوی)

اہل دہلی ہر حالت میں کندھا بولتے ہیں۔ کاندھا نہیں کہتے ؂

کندھا دیا ہے کس بت گلرو نے ناز سے پھولوں میں تُل رہا ہے جنازہ شہید کا (راسخ دہلوی)
تمہیں لوگ لائے تو عزیز و اُٹھا کے کندھوں پر نہ ڈالو خاک میں ہمکو کہ ہیں نہائے ہوئے {سید احمد دہلوی (مؤلف فرہنگ)
ڈھوروں کا ہوا تھا حال پتلا بیلوں نے دیا تھا ڈال کندھا (حالی)

کاندھی دے جانا۔ پہلو تہی کرنا۔ بہانہ کرنا۔ ٹال جانا۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے ؂

جادو ہے آنکھ سُرمہ نہ کیونکر رہے خموش سرکش ہے زلف کاندھی نہ دے شانہ کیا کرے (نسیم لکھنوی)

کانا۔ لکھنؤ میں یک چشم کو کہتے ہیں۔ اور چشم بد دور اہل دہلی اس کو کانڑا بولتے ہیں +
کنجڑیا۔ سبزی فروش ترکاری بیچنے والا۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے اہل دہلی کنجڑا کہتے ہیں +
کھٹ۔ الگ۔ القط۔ دانت سے کسی چیز یا اُنگلی کے ناخن کو لگا کر جو آواز
نکالیں۔ لکھنؤ میں بولتے ہیں + دلی والے اس آواز کو کُٹ کہتے ہیں +
کچاہند۔ کچا مصالح رہنے کی بو۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔ اہل دہلی کچیاند
کہتے ہیں +
کُدکڑے یا کُدکے مارنا۔ کودتے پھرنا۔ اول لفظ دہلی کی عورتیں اور دوم اہل
لکھنؤ بولتے ہیں ؂

کیجئے کیا ہی انندیں۔ ڈیوے چھپٹی اگر آتو۔
ماریئے کیا ہی کڈکے جاوے جو اپنے گھر آتو

کرمل۔ کانوں کے نیچے کا ورم۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔ اہل دہلی کن پیڑ کہتے ہیں۔
کڑنگا۔ وہ شخص جو سخت گو سخت کلام اور نہایت توانا و قوی ہو۔ لکھنؤ میں
رائج ہے۔

کرور۔ اہل لکھنؤ دونوں جگہ رائے مہملہ بولتے ہیں ؎

بلبل سے لڑکے ہم نے کیا عشق فاش واقف ہزار تھے تو کھلا اب کرور پر
ہوتے ہو باغ میں جو غزل خواں تم اے نسیم! خندہ گلوں کو آتا ہے بلبل کے شور پر (نسیم لکھنوی)
اب ہے پتنگ بازی قاتل بہ زور پر۔ عاشق کے دل کے شیشے کا مانجھا ہے ڈور پر
اک برگ گل جو جنبش منقار سے گرا صیاد نے ہزار کے نوچے کرور پر۔ (امانت لکھنوی)

اہل دہلی آخر میں رائے ثقیلہ بولتے ہیں۔ اور کروڑ کہتے ہیں ؎

بات سن پائیں گر مروڑ کی ایک کہہ دیں لاکھوں میں ہم کروڑ کی ایک۔ (ظفر دہلوی)

کسا جانا۔ کھانے یا سالن وغیرہ کا خراب ہو جانا۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔ اہل
دہلی کسیا جانا کہتے ہیں۔

کسک آنا۔ ضرب پہنچنا۔ جھٹکا لگنا۔ لکھنؤ کا محاورہ ہے ؎

مزاج پوچھا کسی کا تو اُن کا منہ دیکھا کسک سی ہاتھ میں آئی اگر سلام کیا۔ (اخگر لکھنوی)

کسنا۔ سوا مشہور معنی کے لکھنؤ میں بٹیروں کے باہم لڑنے کو بھی کہتے ہیں۔
کفش خانہ۔ غریب خانہ۔ دولت خانہ کا نقیض۔ انکساراً اپنا مکان لکھنؤ میں
بولا جاتا ہے ؎

یہ گھر بھی کفش خانہ ہے آخر حضور کا تشریف یاں بھی لایا کریں گاہ گاہ آپ (رقلق لکھنوی)

کفن کھسوٹ - یہ لکھنؤ کا لفظ ہے - دلی میں کفن چور بولتے ہیں +
کلیجا بڑھ جانا - دل بڑھ جانا - وفور خوشی اور جوشِ مسرت سے دل کا شگفتہ اور
باغ باغ ہونا - اہل لکھنؤ کا محاورہ ہے ؎
پارۂ اپنی شادی مرگ مجھکو ہوگئی   بحر بیت پھٹ گیا ایسا کلیجا بڑھ گیا - (بحر لکھنوی)
کلی کھتری کرنا - بوریا بدھنا سنبھالنا - گھر کا اسباب اٹھانا - لکھنؤ میں مستعمل ہے۔
کمینڈ - دغا - فریب - لکھنؤ کا لفظ ہے - کمینڈیا اس کا فاعل آتا ہے +
کنائی کاٹنا - ایک رستہ چھوڑ کر دوسرا رستہ اختیار کرنا - لکھنؤ والے بولتے
ہیں - دلی میں کنی کاٹنا زیادہ مستعمل ہے +
کنٹھا اٹھانا - تسبیح یا مالا کی قسم کھانا - اہل لکھنؤ کا محاورہ ہے ؎
ہم سے نہ ہو غبار یہ باور نہیں ہمیں -   گو تم نے خاک پاک کا کنٹھا اٹھا لیا (بحر لکھنوی)
کنٹیا - کانٹا کی تصغیر - مچھلی پکڑنے کا کانٹا - لکھنؤ میں بولا جاتا ہے +
کو - علامت مفعول - اس کے متعلق ہم کسی قدر مفصل لکھنا چاہتے ہیں بعض
اصحاب فعل مجہول کے ساتھ "کو" لاتے ہیں - مثلاً اس کتاب میں بہت اچھے مضمون
کو بیان کیا گیا ہے" یہ صریح غلطی ہے - عام قاعدہ فعل معروف میں یہ ہے کہ فعل
کا اسناد ہمیشہ فاعل کی طرف ہوتا ہے - اور فعل مجہول میں (جو ظاہر ہے کہ ہر حال
میں متعدی ہوگا) بصورت ایک مفعول ہونے کے فعل کا اسناد مفعول کی طرف
ہوتا ہے - اور اگر اس فعل متعدی کے دو مفعول ہوں تو مجہول ہونے میں مفعول
اول یعنے مفعول بہ کو کے ساتھ استعمال کیا جائیگا - اور مفعول ثانی مفعول مالم
یسم فاعلہ بن کر فعل کا مسند الیہ قرار پائے گا - اور اگر کسی قرینے سے مفعول ثانی
حذف کیا جائے - تو اس صورت میں مفعول بہ بدستور کو کے ساتھ مذکور ہوگا +
اس تصریح سے ظاہر ہوتا ہے - کہ حقیقت میں یہ قاعدہ صرف کو کے لئے

مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اسناد فعل کے طریق سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ "انہیں روک لیا گیا" کہنا بھی ناجایز ہے۔ حالانکہ اس میں کو کا لفظ نہیں آیا۔ کیونکہ اس مثال میں فعل کا اسناد اسم اشارہ کی طرف ہونے کی وجہ سے اسکا فاعلی صورت میں آنا ضرور ہے نہ کہ مفعولی صورت میں اور "زید کو سمجھایا گیا" کہنا اس وجہ سے جایز ہے۔ کہ سمجھایا گیا فعل متعدی بدو مفعول ہے۔ جس کے مجہول ہونیکی صورت میں فعل کا اسناد امر کی طرف کیا گیا ہے۔ اور چونکہ غایت وضوح کی وجہ سے امر کو اختصاراً حذف کر دیا ہے۔ اس لئے ظاہر بین کو دھوکا ہوتا ہے۔ کہ "زید کو سمجھایا گیا" میں فعل کا اسناد مفعول اوّل کی طرف ہے۔ جس کے ساتھ کو لانا ناجائز ہے۔ اسی مثال کو مدنظر رکھکر اور یہ فرض کرکے کہ "زید کو سمجھایا گیا" کہنا جایز ہے تو "زید کو روک لیا گیا" کہنا کیوں ناجایز ہوگیا؟ بعض لوگ غلطی میں پڑ گئے۔ حالانکہ روک لینا نہ متعدی بدو مفعول ہے۔ اور نہ اس کا مفعول ثانی متبادر ہے +

یہ غلطی پنجابی اخبارات اور دہلوی حضرات کی تحریروں میں بکثرت پائی جاتی ہے غرض "اسکو مارا گیا" یا "اس کو روک لیا گیا" کہنا بالکل غلط ہے۔ "وہ مارا گیا" یا "وہ روک لیا گیا" کہنا چاہئے۔ اہل لکھنؤ اس کی احتیاط رکھتے ہیں اور اہل دہلی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ اور اسی وجہ سے یہ غلطی عام طور سے رائج ہوگئی ہے +

کوندا۔ جو اکثر برسات کے دنوں میں بجلی کی طرح آسمان پر چمکتا ہے۔ اور اس میں آواز نہیں ہوتی۔ ؎

پکارے ہے کہ وہ کوندا لگا وہ مینھہ آیا۔ پڑی ہے دھوم مرے اشک و آہ کی ایسی (بحر لکھنوی)

لکھنؤ میں رائج ہے۔ دلی میں نہیں سنا گیا۔ وہاں کے لوگ غالباً کوند کہتے ہیں +

کھانڈا۔ لکھنؤ میں تلوار کو کہتے ہیں۔ دلی میں کھنڈا بولتے ہیں +

گھٹیا۔ لکھنؤ میں ریوڑی کو بھی کہہ دیتے ہیں +

کھرّا۔ طول طویل خط۔ طومار۔ لکھنؤ کا لفظ ہے ؎

پڑھ سکیگا کون محشر میں کسکو ہو دماغ   لکھتے لکھتے نامۂ اعمال کھرّا ہوگیا   (اسیر لکھنوی)

خط مرا پھینک کے مجھ پر یہ کہا قاصد نے   وہ بھی ہو آپ پہ عاشق تو یہ کھرّا دیکھو   (امیر مینائی)

کھرّا۔ درشت۔ سخت۔ بدمزاج۔ اکل کھرا۔ اکھڑ مزاج۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے +

کھلّی۔ ہنسی۔ دل لگی۔ لکھنؤ اور پنجاب میں بولا جاتا ہے۔ مصرع

کھلیوں میں عندلیبوں کو اُڑایا چاہیئے ∗ (ناسخ لکھنوی)

کھلّی میں لینا۔ ہنسی اور مذاق سے تنگ کرنا۔ مسخرا بنانا۔ لکھنؤ اور پنجاب میں رائج ہے

شرم غنچے کو رہی تیرے دہن سے ورنہ   کھلیوں میں اُسے اک اک گل خنداں لیتا (بحر لکھنوی)

کھلے بندھن۔ کنایہ ہے اس شخص سے جو آزاد ہو۔ اور کسی چیز کا پابند نہ ہو۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے + جناب جلال نے لکھا ہے۔ اہل دہلی کھلے بند کہتے ہیں ؎

کہا صبحدم میں نے غنچے سے جاکر   کھلے بند مُرغ چمن سے ملا کر   (میر تقی دہلوی)

کھونسنا۔ اُڑسنا۔ بھرنا۔ پورب اور لکھنؤ میں بولا جاتا ہے ؎

بال زلفوں کے دیئے کھونس اُس نے جو ٹوٹے ہوئے   سانپ کی بانبی میں سمجھا رخنۂ دیوار کو۔   (ناسخ لکھنوی)

کھیت کا لکھا پڑھا۔ گنوار۔ دہقان۔ کسان۔ دیہاتی اہل لکھنؤ کا محاورہ ہے ∗

حرف گ

گُرگا۔ چھوکرا۔ گرو کی ٹہل کرنے والا۔ چیلا۔ شاگرد۔ اہل دہلی ان معنوں میں بولتے ہیں۔ اور اہل لکھنؤ بدکار و بدوضع کو گُرگا کہتے ہیں۔

گلوخلاصی۔ چھٹکارا۔ رہائی۔ پیچھا چھوٹنا۔ جھگڑے وغیرہ سے بچنا۔ لکھنؤ کا لفظ ہے +

گلّی ڈنڈا۔ لڑکوں کا کھیل۔ لکھنؤ اور پنجاب میں بضم گاف فارسی بولا جاتا ہے اور

دلی میں بکسرہ مستعمل ہے ؎

گلے باز۔ خوش گلو۔ خوش آواز۔ اچھی آواز سے گانے یا پڑھنے والا۔ لکھنؤ کا فصیح

گلے لگنا۔ معمولی معنوں کے سوا لکھنؤ میں سر منڈھنے۔ سر ڈالنے اور زبردستی حوالہ کرنے
کو بھی کہتے ہیں۔ جناب جلال لکھنوی نے بھی اس کے معنے کسی چیز کا بے خواہش اور
بے طلب کسی کو دینا لکھے ہیں ؎

گنج ڈالنا۔ کسی بازار کا بنانا۔ جہاں غلہ وغیرہ فروخت کیا جائے۔ لکھنؤ میں بولا جاتا

عدم کی راہ میں اک گنج ڈالتے ہے بحر   ہمارے پاس نہ قارون کا خزانہ ہوا (بحر لکھنوی)

گنٹھری وار۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔ اہل دہلی گنڈے دار کہتے ہیں ؎

گنگا اٹھانا۔ دریائے گنگ کی قسم کھانا۔ لکھنؤ کا محاورہ ہے ؎

چاہا قسم جو یار تو کیا کیا اٹھائیے   قرآن سر سے آنکھوں سے گنگا اٹھائیے (اسیر لکھنوی)

چاہ اپنی مانتا نہیں وہ بے یقیں اگر   قرآن کا جامہ پہنے گنگا اٹھائیے۔ (نسیم لکھنوی)

گوچنا۔ کسی چیز کا ہوا کے رخ پر اس طرح پکڑنا کہ زمین پر نہ گرنے پائے بلکہ گونچنا۔
نون غنہ کے ساتھ زیادہ بولا جاتا ہے۔ لکھنؤ میں مستعمل ہے ؎

گودہ۔ کیلوں کی بھری ہوئی شاخ۔ کیلوں کا خوشہ یہ بھی لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔

گور میں پاؤں رکھنا۔ مرنے کے قریب ہونا۔ مرنے کو بیٹھنا۔ آخیر عمر ہونا۔ نہایت
بوڑھا ہونا۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے ؎

ہم تو اب گور میں ہیں پا رکھے   زندہ اسے بت تجھے خدا رکھے   (امانت لکھنوی)

گونڈی۔ یہ لفظ پنجاب اور لکھنؤ میں اسی طرح بولا جاتا ہے۔ مگر اہل دہلی غیر فصیح
سمجھتے ہیں۔ اور گوندنی کہتے ہیں۔ اہل لکھنؤ کے نزدیک گوندنی میں نی کا نون غلط ہے

گھایل۔ زخمی۔ مجروح۔ جناب جلال فرماتے ہیں۔ شیخ امداد علی بحر لکھنوی اس لفظ
کو یائے تحتانی کی فتحہ سے صحیح جانتے تھے۔ اور صندل و مخمل وغیرہ کے قافیے میں

لاتے تھے۔ لیکن اتفاق جمہور فصحائے لکھنؤ کا لغت مذکور میں یائے تحتانی کے کسرے ہی پر ہے۔ یعنی مکسور پڑھتے ہیں۔ اور دل بسمل وغیرہ کے قافیے میں لاتے ہیں "مگر بعض اہل دہلی اور ہندی والے لغات بہ فتح یائے تحتانی صحیح و فصیح خیال کرتے ہیں البتہ مولانا حالی نے مسدس مدوجزر اسلام کے ایک بند میں یہ لفظ اس طرح موزوں کیا ہے ؎

نہ احباب کی تیغ احساں سے گھائل۔ نہ بیٹے سے مطلب بھائی سے سائل
نہ دکھ درد میں سوئے آرام مائل نہ دریا و کوہ اُن کے رستے میں حائل۔ (حالی)

لیکن اس بند کی صورت علیحدہ ہے کیونکہ اس میں چاروں قافیوں کی آواز یکساں ہے۔ گو سائل۔ مائل وغیرہ کھلے طور پر دل بسمل کے ساتھ باندھے جاتے ہیں اور ان کی یائے تحتانی کا مکسور ہونا مسلم ہے۔ پھر بھی مولانا حالی کا یہ خیال اچھوتا ہے۔ کہ انہوں نے گھائل کو دل بسمل کے ساتھ نہیں باندھا۔ اور سائل مائل کے ساتھ استعمال کیا۔

اصل بات یہ ہے۔ کہ لفظ گھائل۔ قائل۔ مائل۔ سائل وغیرہ جیسے اسم فاعل سے ملتا جلتا تھا۔ اس لئے شعرائے سلف بکسر یا باندھا گئے۔ ناسخ و آتش وغیرہ بھی اس میں انہی کے متبع رہے۔ لیکن چونکہ کسرہ خلاف قاعدہ تھا۔ کیونکہ یہ لفظ مرکب ہے۔ گھاؤ اور یل سے۔ جو فاعلیت کے معنی پیدا کرتا ہے۔ جب پہلا جزو ساکن الآخر ہوتا ہے۔ تو یل کی (ی) مفتوح ہوتی ہے۔ جیسے اڑیل۔ سڑیل چھٹیل وغیرہ۔ اور لہجے کی یہ حالت تھی۔ کہ جو حضرات اساتذہ کا کلام دیکھا کرتے تھے۔ اُنکی زبان پر وہی بکسر یا چڑھا ہوا تھا۔ مگر جن کو شعر و سخن سے چنداں تعلق نہ تھا۔ اور لکھنؤ کے خاص اہل زبان سمجھے جاتے تھے۔ ان کا لہجہ بفتح یا تھا۔ اس سبب سے بعض خواص نے اس کی اصلاح کی اور کسرے کو فتحہ سے بدل دیا۔ اسی زمانے سے اکثر

فصحا گھایل بکسر یا سے احتیاط رکھتے ہیں۔ اہل لکھنؤ کے ہاں دونوں طرح مستعمل ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

نہ زخمی بدن ہیں نہ گھائل ہوئے ہیں ۔۔۔ نہ خونیں کفن ہیں نہ بسمل ہوئے ہیں۔
لہو ملکے کشتوں میں داخل ہوئے ہیں ۔۔۔ تمہارے شہیدوں میں شامل ہوئے ہیں (نسیم لکھنوی)

گل و لالۂ و ارغواں کیسے کیسے۔

برگشتہ وہ مژہ دل مجروح سے ہوئی ۔۔۔ ہے سوزن مسیح کا گھائل سے دل اچاٹ (رند لکھنوی)

یہ شعر دل بسمل وغیرہ قافیوں کی غزل میں ہے۔ منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی۔ جناب تسلیم۔ فصیح الملک داغ دہلوی نے دل۔ مائل وغیرہ قافیوں کی غزلوں میں گھائل نہیں باندھا۔ اور خود جناب جلال نے بھی گھائل کو بکسر یا باندھنے سے احتیاط کی ہے۔ اگرچہ وہ اس کی فصاحت کے قائل ہیں۔ اور گھایل بفتح یا کو غیر فصیح سمجھتے ہیں۔ جناب جلال کی تحریر دیکھ کر ناواقف آدمی دھوکے میں پڑ سکتا ہے۔ اب گھایل بفتح یا کی مثالیں درج کی جاتی ہیں :۔

یہ دی ہے بیکلی تو نے کہ لیں ہیں کل سے ۔۔۔ کہ دھو کر زندگی سے ہاتھ پونچھوں تیرے آنچل سے
ستم کیا کیا نہ ہوگا اس قمر طلعت کے کشتے پر ۔۔۔ کرے گی چاندنی اب ناز معشوقانہ گھایل سے (ہجر لکھنوی)

کہاں کیونکر نہ ہو خلد بریں کا صحن مقتل پر ۔۔۔ تصدق ہوتی ہیں حوریں ترے خنجر کے گھایل پر (تسلیم لکھنوی)

گھر جھکنی۔ وہ عورت جو پاس پڑوس کے گھر جھانکتی پھرے۔ لکھنؤ میں مستعمل ہے۔

گھڑنا۔ زرگروں کا ظروف اور زیور بنانا۔ زدوکوب کرنا۔ اس کے استعمال میں یہ فرق ہے کہ اہل لکھنؤ گڑھنا اور گھڑنا دونوں طرح بولتے ہیں۔ اور اہل دہلی صرف گھڑنا کہتے ہیں مصرع

سر گر سنار نے تیرے زیور گھڑے نہیں۔ (رشک لکھنوی)

گھر میں زرگر کے گڑھے جاتے ہیں واں سونے کے طوق ۔۔۔ بیڑیاں ڈھل رہی ہیں خانۂ حداد میں (امانت لکھنوی)

لکھنؤ میں گرُھنے کے مستعمل ہونیکی یہ کافی دلیل ہے ۔ کہ جناب جلال لکھنوی نے اپنی کتاب میں گرُھنا کا لغت قایم کیا ہے ۔ دِلّی والے گرُھنا نہیں بولتے ؎

سلسلہ بات کا بگڑتا ہے ۔ نامہ بر بات جی سے گھڑتا ہے (داغ دہلوی)

گھسٹنا ۔ جناب جلال فرماتے ہیں ۔ اس لفظ کو حرف اوّل کے کسرے اور حرف دوم کے فتحہ سے بولنا موّلف کے نزدیک غیر فصیح ہے ۔ یعنی گھِسٹنا کہنا ٹھیک نہیں ۔ اہل دہلی اسی طرح بولتے ہیں ۔ اور منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنوی بھی اسی کے عامل تھے ؎

زور ساز ور ہے کچھ پاؤں میں اُسکے جو پڑے ۔ عرش آئے ابھی زنجیر کے ہمراہ گھسٹ (امیر مینائی)

یہ ایک قصیدے کا شعر ہے ۔ جس کے قافئے سرپٹ تلپٹ وغیرہ ہیں ۔ جناب جلال کے قول کے موافق مِٹ وغیرہ کے ساتھ گھسِٹ آنا چاہیئے ۔

گھسّن پٹی ۔ زدوکوب ۔ مارپیٹ ۔ لکھنؤ کا محاورہ ہے ۔

گھمن گھور لڑائی ۔ محاربۂ عظیم ۔ یہ محاورہ بھی لکھنؤ میں بولاجاتا ہے ۔

گھوسے میں ڈالنا ۔ اُلجھاویں ڈالنا ۔ کسی ایسے کام میں مصروف کرنا ۔ کہ وہ تمام نہ ہو ۔ لکھنؤ میں بولاجاتا ہے ۔

گھومنا ۔ چکر کھانا ۔ لکھنؤ میں بولاجاتا ہے ۔ اہل دہلی کی زبان سے ناممکن ہے ؎

جو دن کو نکلو تو خورشید گرد سر گھومے ۔ چلو جو شب کو تو قدموں پہ ماہتاب گرے (نسیم لکھنوی)

گھومنی ۔ لکھنؤ میں دوران سر کو کہتے ہیں ۔ دِلّی میں نہیں بولاجاتا ۔

گیند ۔ کپڑے یا چمڑے کا چھوٹا سا گولا ۔ جس سے لڑکے کھیلتے ہیں ۔ لکھنؤ ۔ اور پنجاب میں مذکر بولاجاتا ہے ۔ دِلّی والے مونث کہتے ہیں ؎

بنتا ہے تیرے واسطے کاغذ بادی آسماں ۔ گیند ہے تیری کھیل کا یہ کرۂ زمیں نہیں ۔ (رشک لکھنوی)

ستارے مرے دیکھے بھالے ہوئے ہیں ۔ یہ سب گیند اُن کے اچھالے ہوئے ہیں ۔ (امیر مینائی)

جی کلائی کی نزاکت سے دھڑکتا ہے مرا۔ ہاتھ میں گیند اٹھا تم نے اچھالی ہے ڈھب (ظفر دہلوی)

گیندیں سپٹے کھاتی ہیں میدان میں (مصرع آغا شاعر دہلوی)

حرف ل

لاڑھیا۔ وہ شخص جو بُرے اسباب اور اشیاء کو اچھا کر کے بیچے اور معاملات دنیا میں لوگوں سے فریب اور جعل کرے۔ لکھنؤ میں مستعمل ہے *

لت روندن۔ پائمالی کو کہتے ہیں۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے *

لٹر بیہودہ آدمی سے عبارت ہے۔ لچر۔ واہیات۔ اہل لکھنؤ بولتے ہیں *

لڑکوری۔ وہ عورت جو بچہ رکھتی ہو۔ یہ بھی لکھنؤ کا لفظ ہے *

لچنا۔ جھکنا۔ خمیدہ ہونا۔ متواضع ہونا۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے *

لسر کا۔ واسطہ۔ سبب۔ علاقہ لکھنؤ میں رائج ہے ؎

تعلقات جہاں قطع کر چکا ہوں مگر۔ ہنوز الفتِ احباب کے لسر کے ہیں (ہجر لکھنوی)

لفظ۔ بعض اہل لکھنؤ اور متقدین زبان لکھنؤ مونث بھی کہتے ہیں۔ اور یہ اختلاف پہلے سے چلا آتا ہے * ؎

وصل کی رات بنا نامۂ شوقِ گیسو۔ شام لفظیں ہیں سفیدی ہے سحر کا غذ کی (رشک لکھنوی)

لنگوٹیل یار۔ جس سے عہد طفلی سے یارانہ ہو۔ اہل لکھنؤ بولتے ہیں۔ دلی والے لنگوٹیا یار کہتے ہیں *

لونیٹر۔ دراز قد۔ احمق کو کہتے ہیں۔ یہ بھی لکھنؤ میں بولا جاتا ہے *

لوہا برسنا۔ کنایہ ہے بہت تلوار چلنے اور کشت و خون ہونے سے۔ لکھنؤ کا محاورہ ہے۔ ؎

بھویں بالوں سے ہیں شمشیر ابری کہیں عشاق میں لوہا نہ برسے (ہجر لکھنوی)

لہٹر۔ لکھنؤ میں لمبے بانس کو کہتے ہیں +

حرف م

ماشاء اللہ سے۔ بعض کم علم اہل لکھنؤ اور خصوصاً عورتیں ماشاء اللہ کی جگہ بولتی ہیں۔ دلی میں صرف ماشاء اللہ کہتے ہیں +

مالا۔ یہ لفظ لکھنؤ میں مذکر بولا جاتا ہے ؎

تیرا مالا موتیوں کا قتل کرتا ہے مجھے — اے پری مالا سروہی کا یہ مالا ہو گیا (ناسخ لکھنوی)

اے شہادت میں نہیں طالب جڑاؤ ہار کا — چاہیئے زلو میں مالا تیغ جوہر دار کا۔ (رشک لکھنوی)

ہے بر یار شبیہ ترے دانتوں کے عکس پر — مالا گلے کا ٹوٹ کے موتی بکھر گئے۔ (بحر لکھنوی)

وا عکس دنداں ہے سینہ پر اُس کے — نہیں موتیوں کا یہ مالا پڑا ہے (امانت لکھنوی)

آبروئے الفتِ دندانِ قاتل میں ملی — اپنا مالا اب گلے میں جیسے گوہر تابی ہے تیغ (امیر مینائی)

حضرت نسیم دہلوی نے بھی مالا کو مذکر ہی باندھا ہے۔ مگر اس زمانے کے فصحائے دہلی مونث کہتے ہیں۔ مذکر بالکل نہیں بولتے۔ جناب جلال لکھنوی نے رسالہ تذکیر و تانیث میں اور منشی سید احمد صاحب دہلوی نے فرہنگ آصفیہ میں اس لفظ کے متعلق یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ اور دہلی میں راقم الحروف نے بھی اکثر ثقہ لوگوں کی زبان سے اس کو مونث سنا ہے +

مان۔ قدر و منزلت۔ مرتبہ۔ دلی میں بولا جاتا ہے۔ اہل لکھنؤ نہیں بولتے ؎

الطاف و کرم غیر پہ رہتا ہے تمہارا — تم جانتے ذرہ بھی نہیں مان کسی کا (ظفر دہلوی)

مٹھیا۔ ہل کا دستہ قبضہ۔ چوب دستی کی موٹھ۔ لکھنؤ میں سونے یا چاندی کے ڈھولنے کو کہتے ہیں۔ جس میں تعویذ رکھ کر بازو پر باندھتے ہیں +

مجلس جیراں۔ لکھنؤ میں ایک طرح کی نہایت عمدہ مسی کو کہتے ہیں +

مجھولی۔ وسطی۔ درمیانی۔ اہل دہلی گاڑی کے معنوں میں ﻫ کے بعد ن زیادہ کرکے منجھولی کہتے ہیں۔ مگر اہل لکھنؤ اسے بھی مجھولی ہی کہتے ہیں ؎

تصور میں مرے کیا کیا پری مضمون پھرتے ہیں   مری نازک خیالی ان حسینوں کی مجھولی ہے۔ (امیر مینائی)

مچھی۔ بھنے بوسہ۔ اہل لکھنؤ بولتے ہیں۔ دلی میں مستعمل نہیں ؎

لب وہ ایسے کہ جان دید یجیے   دہن ایسا کہ مچھیاں لیجے (شوق لکھنوی)

ملائی۔ دودھ کا جوہر۔ جو گرم کرنے سے اوپر جم جاتا ہے۔ دودھ کے اوپر کی پپڑی نواب سعادت علی خاں مرحوم نے اس کا نام بالائی رکھا تھا۔ چنانچہ یہ لفظ لکھنؤ میں عام اور دلی میں بہت کم بولا جاتا ہے۔ یہ کیفیت صاحب فرہنگ آصفیہ نے لکھی ہے۔ اب اس لفظ کے متعلق جناب جلال کی عبارت بھی ملاحظہ ہو۔

"ملائی اک چیز ہوتی ہے دودھ کی بہت لذیذ اور عمدہ و لطیف اور یہ جو اس کو بالائی بائے موحدہ اور الف کے ساتھ بولتے ہیں۔ غلط بولتے ہیں"

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ جلال لکھنوی بالائی کی فصاحت کے قایل نہیں۔ ملائی کو فصیح سمجھتے ہیں۔ حالانکہ بالائی لکھنؤ کا مشہور لفظ ہے ؏

منجنا۔ لکھنؤ و پنجاب میں اُجالنے اور صاف کرنے کو کہتے ہیں ؎

مانجھ کر داشت اُس دُرِ یکتا نے جب کیں کُلّیاں
آبِ گوہر کا چھٹا فوارہ موتی جھیل میں ؏ (امانت لکھنوی)

آشنا ایڑیاں رگڑینگے مثالِ بسمل
ناز سے مانجھ نہ دریا کے کنارے تلوے ؏ (امانت لکھنوی)

اہل دہلی ج کے بعد ھ زیادہ کرکے منجھنا بولتے ہیں ؏

مُنہ بولی بہن بنائی اُس کو۔ یہ مثنوی گلزار نسیم مصنفہ پنڈت دیا شنکر لکھنوی کی مشہور مثنوی کے ایک شعر کا مصرع ہے پورا شعر اس طرح ہے ؎

پوشیدہ گھر اسکے لائی اُس کو ۔۔۔ مُنہ بولی بہن بنائی اُس کو

اس کے متعلق منشی سید احمد صاحب دہلوی نے اپنی کتاب فرہنگ آصفیہ میں لکھا ہے۔ کہ اہل دہلی "مُنہ بولی بہن بنایا اُس کو" کہتے ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک جناب نسیم سے سہو ہوا ہے۔ کہ انہوں نے اس موقع پر قواعد کا خیال نہیں رکھا۔ ورنہ دہلی اور لکھنؤ میں یہ جملہ ایک ہی طرح بولا جاتا ہے +

ملّو۔ (بواؤ مجہول) اہل لکھنؤ اُس پرند جانور کو کہتے ہیں۔ جس کے پاؤں باندھ کر جال میں ڈال دیں۔ تاکہ اُسے دیکھ کر اَور پرند آپھنسیں۔ اہل دہلی اُسکو مُلا کہتے ہیں

منگنا۔ ادنے مخالفت و سرتابی کرنا۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے +

مُہرا آنا۔ کسی کو طنز کی بات کہنا۔ اہل لکھنؤ کا محاورہ ہے ؎

ششدر ہوں کہ ہے مُہرِ دہن کیسی خموشی

مُہرا بھی کبھی وہ بُتِ انور نہیں آتا + (اسیر لکھنوی)

مہیں۔ جناب جلال لکھنوی نے اس لفظ کی یہ تشریح کی ہے۔ کہ تحتانی معروف اور اخفائے نون کے ساتھ اک کلمہ ہے کہ فایدہ اپنی ذات کے حصر کے معنی کا دیتا ہے۔ اور جو اس کو میں ہی پڑھتے یا لکھتے ہیں۔ مولف ہیچمدان کے عندیہ میں غلط ہے اور اعلان نون کے ساتھ لفظ باریک کا ترجمہ ہے"

جناب جلال کا یہ اجتہاد باقاعدہ ضرور ہے۔ کیونکہ جب تم ہی۔ ہم ہی۔ کو تمہیں اور ہمیں کہتے ہیں۔ تو اسی قیاس پر میں ہی کو بھی مہیں کہنا چاہئے۔ مگر تمہیں ہمیں کے مقابلہ میں یہ لفظ نہایت غیر فصیح معلوم ہوتا ہے۔ شاید اجنبیت کی وجہ سے + اور سچ پوچھیے تو یہ اجتہاد ایسا ہے۔ جیسے کوئی یہاں وہاں کے قیاس پر کہ ان کا مخفف یاں اور واں آتا ہے۔ کہاں کا مخفف کاں کرنا چاہے + شعراے دہلی و لکھنؤ میں سے اَور کوئی اس کا عامل نہیں پایا جاتا۔ صرف جناب جلال اور انکے شاگرد لکھتے ہیں ؎

جلا یا کئے وہ شب وصل بھی ٭ ہمیں رات بھر شمع محفل رہا (جلال لکھنوی)

حرف ن

نا۔ اس کی بحث ذرا مفصل و دلچسپ ہے۔ اس لئے ہم فصحائے لکھنؤ و دہلی کی تحریریں بجنسہ درج کئے دیتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ناظرین خود اچھی طرح فیصلہ کر لینگے :۔

جناب جلال لکھنوی اپنی کتاب قواعد المنتخب میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ (نا) اِک کلمہ ہے۔ کہ ہندی میں واضح تر اور مشہور تر علامت مصدری یہی ہے۔ یعنی بیشتر اسی کلمے کو افعال امر حاضر کے آخر میں مصدر بنانے کیواسطے لاتے ہیں جیسے آنا۔ جانا۔ ڈرنا۔ کرنا۔ رونا۔ ہونا۔ ہنسنا۔ بولنا۔ اٹھنا۔ بیٹھنا۔ دیکھنا۔ سُننا وغیرہ ہیں۔ تنبیہ درحالیکہ مفعول کسی فعل کا مونث ہو۔ تو اس حالت میں جو بعضے اس علامت مصدری یعنی کلمۂ نا کے الف کو یائے معروف سے بدل کر بولتے ہیں۔ یعنی اس طرح کہ "بات کرنی مشکل ہے۔ یا روٹی کھانی دشوار ہوگئی۔ یا نماز پڑھنی آسان نہیں" یہ محاورہ خاص فصحائے دہلی یا فصحائے متقدمین لکھنؤ کا ہے۔ فصحائے متاخرین لکھنؤ یوں نہیں بولتے۔ بلکہ یہ خواہ مفعول مذکر ہو۔ خواہ مونث۔ کسی حال میں علامت مصدری کو تغیر نہیں دیتے۔ یعنی بات کرنا۔ روٹی کھانا۔ نماز پڑھنا ہی کہیں گے۔ بات کرنی۔ روٹی کھانی۔ نماز پڑھنی نہ بولیں گے۔ کیونکہ ان کا قول یہ ہے۔ کہ آج تک علامت مصدر کی سوا (نا) کے (نی) بیائے معروف سے نہیں سُنی۔ اور قواعد زبان اردو کے جامعین قدیم میں سے بھی کسی نے نہیں لکھی۔ پس علامت کیونکر بدل سکتی ہے۔ کس واسطے کہ اگر شناخت ہی کسی شے کی بدل جائیگی۔ تو وہ شے پہچانی

ہرگز نہ جائے گی۔ چنانچہ مولف ہیچمدان بھی اس قول کو مسلم رکھتا ہے۔ اور اسیطرف ہے کہ کسی حال میں علامت مصدری کو تغیر نہ دینا چاہئے۔ اور بحال خود ہی رکھنا چاہئے اس کا مدلل جواب جناب ضیاؔ دہلوی نے رسالہ تحقیقات ضیاء میں نہایت عمدگی سے دیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

علامت مصدر کو تغیر نہ ہو۔ یہ قاعدہ فارسی زبان کے متعلق ہے۔ اس لئے کہ فارسی میں تذکیر و تانیث کی قید نہیں ہے۔ اور ہندی میں اس قید کی وجہ سے علامت تذکیر و تانیث لاکر مفعول کے مذکر یا مونث ہونے کی خبر نکالنی مقدم سمجھی جاتی ہے۔ اسی سبب سے متقدین لکھنؤ میں اس کا استعمال تھا۔

قولہ قواعد زبان اردو کے جامعین میں سے بھی کسی نے نہیں لکھی۔ مولف کہتا ہے کہ جامعین قواعد کے لکھنے نہ لکھنے کی چند صورتیں ہیں +

اوّل یہ کہ جامعین قواعد جب لکھتے۔ کہ بغیر کسی ترکیب کے انفرادی حالت میں علامت مصدر کا تغیر ہوتا۔

دوسرے۔ یہ کہ یہ نی۔ نا کے مفہوم کی نہیں ہے۔ اس میں (الف۔ سے) کا تبدل اظہار خبر تانیث مفعول کے واسطے ہوا ہے۔ اور یہ اردو میں عام قاعدہ ہے ہاں اگر نا اور تی کا تغیر تبدل صرف علامت مصدر کے مفہوم کا ہوتا تو جامعین قواعد ضرور لکھتے +

تیسرے یہ کہ شاید جامعین قواعد سے بسبب بشریت رہ گیا ہو اور باوجود استعمال فصحاے دہلی و متقدمین لکھنؤ جامعین قواعد نے جب نہیں لکھا۔ تو اس سے ظاہر ہے۔ کہ ان سے رہ گیا جس طرح اور صدہا مسائل رہ گئے ہیں۔ جو اہل علم سے مخفی نہیں۔ اور جایز نہیں لکھا۔ تو ناجایز بھی نہیں لکھا۔ یہ بات بھی ان کے سہو کو ثابت کرتی ہے +

چوتھے یہ کہ جامعین قواعد کا لکھنا کچھ آیت حدیث نہیں کہ جو انھوں نے لکھا ہے درست ہے جو نہیں لکھا نادرست +

پانچویں یہ کہ ہر زبان میں خلاف قاعدہ بہت سی جگہ استعمال ہوتا ہے اس سے اہل علم خوب واقف ہیں۔ زمخشری ع وَمَنعُ صَرفٍ وصَرفٌ ثُمَّ تَعدِیدٌ ط اس مصرع سے عرب میں خلاف قواعد استعمال کا جایز ہونا ثابت ہے۔ اور فارسی میں بھی استعمال ہے۔ حافظ ؎

شاہ خوبانی و منظور گدایاں شدہ۔ قدر ایں مرتبہ نشناختۂ یعنے چہ +

اس شعر میں صرف کے قاعدے سے واحد حاضر کے واسطے یعنی چہ کی جگہ تعنی چہ ہونا چاہئے + پس اردو زبان میں بھی جامعین قواعد کے لکھنے کو بالکلیہ کیونکر تسلیم کر لیا جائے۔ اہل زبان تو استعمال ہی کو مقدم سمجھیں گے۔ کہ استعمال کے سامنے قواعد ہیچ ہیں۔ اور قواعد کی بنا استعمال ہی پر ہے۔ مگر معلوم یہ ہوتا ہے۔ کہ جامعین قواعد جب یہ لکھ چکے۔ کہ (نا) علامت مصدر ہے۔ اور (ی) کے متعلق یہ تحریر کر چکے۔ کہ تانیث مفعول کے واسطے بھی آتی ہے۔ تو اب زیادہ صراحت کی جامعین قواعد کو ضرورت نہ رہی۔ سمجھنے والے کا کام ہے کہ اس کو سمجھ لے +

قولہ شناخت کسی شے کی کیونکر بدل سکتی ہے؟ مولف کہتا ہے کہ یہ تغیر تعین شناخت کے واسطے ہے۔ تاکہ معلوم ہو۔ کہ مفعول اس جگہ مونث ہے +

قولہ اگر شناخت ہی کسی شے کی بدل جائے گی تو وہ شے پھر کس طرح پہچانی جائے گی؟ مولف کے نزدیک یہ قول اس جگہ صادق نہیں۔ اس لئے کہ جب بات کرنی جان دینی وغیرہ میں (ی) کے تبدل سے وجہ شناخت بدل گئی پہچان نہ رہی تو کیا سامعین ان کے معنے بات کرنے۔ جان دینے کے سوا کچھ

اُور سمجھ لیں گے۔ یا دوسرے جملوں میں التباس ہو جائے گا۔ اگر یہ بات نہیں
اور سننے والے نے ہمارے تلفظ سے باوجود اس تغیّر کے ہمارا مطلب سمجھ لیا
تو پھر بے پہچان بے شناخت کیونکر کہیں گے؟ اگر یہ کہا جائے۔ کہ یہ تغیّر قاعدے
کی رُو سے نادرست ہے۔ تو جواب یہ ہے کہ ہندی میں عام قاعدہ ہے۔ کہ تانیث
مفعول کی خبر کے لئے الف کو (ی) سے بدل دیتے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے۔ کہ
"بات کرنی مشکل تھی۔ جان دینی دشوار تھی" اس طرح کہنے سے دو خرابیاں ہیں تانیث
مفعول کی خبر نکل آئی۔ تو بجائے (نی) کی جگہ (نا) علامت مصدری قائم رکھنا چاہیئے۔
کہ علامت مصدری بھی برقرار رہتی ہے۔ اور تانیث مفعول کی خبر بھی نکل آتی
ہے۔ **جواب** یہ ہے کہ "بات کرنا مشکل تھی۔ جان دینا دشوار تھی" یہ ہرگز زبان
نہیں۔ اور اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کوئی یہ کہے۔ کہ "میں وہاں گیا تھی۔ یا
بیٹھا تھی" اہل زبان کے نزدیک ایک علامت مفعول کے بعد جتنی علامتیں
متصل آئیں گی۔ سب ایک ہی حکم میں مانی جائیں گی۔ جیسے بات کرنی۔ اسمیں
ایک علامت ہے۔ بات کرنی مشکل تھی۔ اس میں دو علامتیں ہیں۔ بات کرنی
مشکل ہو گئی تھی۔ اس میں تین علامتیں ہیں۔ اسی طرح اُور زیادہ بھی۔ غرض
اہل زبان "بات کرنی۔ جان دینی" کہتے ہیں۔ "بات کرنا جان دینا" نہیں کہتے۔

واضح ہو کہ استاد[1] مکرم (حضرت جلالؒ) نے بھی متاخرین لکھنؤ کے
استعمال کے موافق مونث کے ساتھ علامت مصدر کو دیوان اوّل میں نہیں بدلا ہے
جائے شدت مجھے دینا تھا شراب   نزع میں بھی ہے یہاں جام کی حرص
چونکہ استاد موصوف تو ایک اعلےٰ درجے کے شاعر ہیں۔ جب خیال

[1] جناب ضیاء دہلوی فن عروض میں حضرت جلال کے شاگرد ہیں۔ مولف ۱۲

فرمایا۔ کہ اس طرح کہنے سے شراب جو مونث ہے مذکر ہوئی جاتی ہے۔ تو دیوان دوم میں دلی والوں کے مطابق لکھا۔ ؎

میری فریاد الگ سُننی تھی اے داورِ حشر!
اہل محشر میں کیا کاہے کو شامل مجھ کو } جلال لکھنوی

جناب ضیا کی تحریر ختم ہوئی ٭

نا اور نی کی کچھ اور مثالیں بھی شعرائے متاخرین لکھنؤ کے کلام سے پیش کی جاتی ہیں:-

آہ رسا کو سعی تو کرنا ضرور تھا ہمت تھی شرط باب اثر کتنی دور تھا۔ (جلال لکھنوی)

باغباں! کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی بھیجنا ہیں ایک کم سن کے لئے (امیر مینائی)

خاک اُڑانی تھی یہاں تک جستجوئے وصل میں
ایک ہو جاتے زمین و آسمان کوئے دوست ٭ } جلال لکھنوی

گیا دل تو لیکن یہ منزل کڑی ہے ابھی عشق میں جان کھونی پڑی ہے (امیر مینائی)

اہل لکھنؤ کے استعمال کے موافق جناب جلال لکھنوی کے پہلے شعر میں لفظ سعی اس ڈھنگ پر بندھا ہے۔ کہ ناواقف آدمی اُس کو مذکر سمجھ سکتا ہے اسی طرح منشی امیر احمد صاحب کے شعر میں لفظ بھیجنا چنداں فصیح معلوم نہیں ہوتا۔ مگر غنیمت ہے۔ کہ اب اہل لکھنؤ علامت مصدر کو حسب ضرورت تغیر دے لیتے ہیں۔ اور زبان میں اس وجہ سے جو خرابی تھی۔ اُس کی اصلاح ہوتی جاتی ہے + اس کے متعلق یہ آسان قاعدہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ جب مصدر کے ساتھ ایسا مونث لفظ واقع ہو۔ جو اُس کا اور اُس کے مشتقات کا مفعول ہو سکے۔ تو علامت مصدر کا الف یائے معروف سے بدل جاتا ہے ؎

افسوس ہے جو چاہیئے آنی نہیں آتی جا کر یہ دغاباز جوانی نہیں آتی (داغ دہلوی)

مگر دو حالتوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ اول یہ کہ وہ مصدر (خبر) امر کے معنی میں نہ ہو۔ مثلاً ؎

تجھے نامہ بر قسم ہے یہیں دن سے رات کرنا۔
کوئی ایک بات پوچھے تو ہزار بات کرنا + } (داغ دہلوی)

دوسرے یہ کہ مبتدا و خبر کے درمیان حرف اضافت نہ ہو۔ مثلاً ؎

بزم دشمن سے تجھے کون اُٹھا سکتا ہے۔
اک قیامت کا اٹھانا ہے اُٹھانا تیرا + } (داغ دہلوی)

اب یہاں کرنا اور اٹھانا کرنی اور اٹھانی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ پہلی مثال میں مصدر امر ہے۔ اور دوسری مثال میں اضافت موجود ہے +

اسی ضمن میں یہ بات بھی قابل تذکرہ ہے۔ کہ اسماء کے جمع ہونے کی صورت میں اہل دہلی نا کو یائے مجہول سے بدل دیتے ہیں ؎

کیا کہئے گا اب اُور سرِ خاکِ شہیداں ؟
کچھ فتنے اُٹھانے ہوں مزاروں سے تو کہیئے ؟ } (ذوق دہلوی)

متاعِ دل جو ہو سبے کار کیوں نہ ہو دقت ؟
کہ دام اُٹھانے پڑے جنسِ ناروا کے مجھے + } (داغ دہلوی)

نکالے اپنے ہی تلووں سے خار گھڑیوں میں
ابھی تو پاؤں دبانے ہیں رہنما کے مجھے + } (داغ دہلوی)

اہل لکھنؤ کے خیال کے موافق اُٹھانے اور دبانے کی جگہ اُٹھانا اور دبانا چاہیئے تھا۔ جیسا کہ منشی امیر احمد صاحب کے مندرجہ ذیل مسدس سے ظاہر ہے ؎

اللہ اللہ سرزمین مُلکِ دکن کی اور ہم۔ آفریں تجھ کو جزاک اللہ اے شوقِ اتم
سر سے لینا چاہئے تائید باری کے قدم ہو گیا طے وشتِ غربت مل گیا باغِ ارم

حسرتیں دل کی نکل جانے کو دل سے تل گئیں
نور وہ چھایا ہوا دیکھا۔ کہ آنکھیں کھل گئیں

حُسنِ عقیدت کو بالائے طاق رکھ کر انصاف کی نظر کی جائے تو ناظرین کو دہلی و لکھنؤ کے طریق استعمال میں ایک خاص فرق دکھائی دیگا۔ اور وہ بآسانی اس کا فیصلہ کر سکیں گے +

ناقوس پھونکنا۔ اس محاورے کی بحث بھی کسی قدر دلچسپ ہے۔ جناب جلال لکھنوی اپنے لغت سرمایہ زبان اُردو میں اس کی نسبت لکھتے ہیں۔ کہ ناقوس کے صلے میں سوا پھونکنے کے اور کوئی لفظ فصحا کی زبان پر مستعمل نہیں سُنا۔ پس ناقوس بجانا جس نے کہا ہے ہیچمدان کے عندیہ میں غلط کہا ہے +

منشی سیّد احمدؐ صاحب دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ نے شاید جناب جلال ہی تحریر کو دیکھ کر ناقوس پھونکنا کی نسبت اپنی کتاب میں لکھ دیا۔ کہ یہ محاورہ لکھنؤ سے مخصوص ہے۔ حالانکہ دونوں کا خیال غلط ہے۔ جناب جلال کا یہ فرمانا کہ "ناقوس بجانا جس نے کہا ہے غلط کہا ہے" اُس وقت بالکل بے وقعت ہوجاتا ہے + جب خواجہ حیدر علی آتش مرحوم کے کلام سے اس کی مثال ملجاتی ہے + خواجہ صاحب ایسے ویسے استاد نہیں تھے۔ اُن کے لکھنے کو ہم غلط نہیں سمجھ سکتے۔ اور یقیناً آتش مرحوم کی پیروی کرنے والے لکھنؤ میں اب بھی بہت حضرات ہونگے + وہ تو ناقوس بجانا اور ناقوس پھونکنا دونوں طرح درست سمجھیں گے۔ بہرحال جناب جلال کے قول کی تردید تو یوں ہوتی ہے۔ کہ آتش مرحوم نے ناقوس بجانا لکھا ہے ؎

دریا میں غسل کے لئے اُترا جو وہ صنم
ناقوس مچھلیوں نے بجایا حباب کا + (آتش لکھنوی)

اور منشی سید احمد صاحب کا قول اس وجہ سے غیر صحیح ٹھہرتا ہے۔ کہ ذوق مرحوم نے ناقوس پھونکنا استعمال کیا ہے ؎

اب میکدے میں شام کو ناقوس پھونکئے۔
مسجد میں مدتوں رہے تسبیح خوان صبح ۔ (ذوق دہلوی)

اب یہ نتیجہ نکلا۔ کہ ناقوس پھونکنا اور ناقوس بجانا دونوں طرح درست ہے۔ اور دونوں جگہ مستعمل ہے۔

ناک چھنکنا ۔ ناک کو ہاتھ سے پکڑ کر اُس کی رطوبت صاف کرنا۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔ اہل دہلی ناک سنکنا کہتے ہیں۔

نانگھنا ۔ خندق یا گڑھے وغیرہ سے کود کر گزر جانا۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔ دِلّی والے لانگنا یا لانگھنا کہتے ہیں۔

نُکّا ٹوپی ۔ وہ کلاہ جس کو بلند کر کے سر پر رکھیں۔ اونچی ٹوپی۔ یہ لفظ اہل لکھنؤ کا ایجاد کیا ہوا ہے۔ دِلّی میں نہیں بولا جاتا۔

نوک رہ جانا ۔ بات رہ جانا۔ عزت رہ جانا۔ لکھنؤ کا محاورہ ہے ؎

تیز صفحے پر کھینچے اُس موئے مژگاں کی شبیہ
نوک رہ جائے الٰہی خامۂ بہزاد کی!

حرف ہ

ہاتھ ۔ اہل لکھنؤ اس کو ہر حالت میں ہائے مخلوط التلفظ کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ مگر اہل دہلی بات۔ رات وغیرہ کے قافئے میں بھی باندھ جاتے ہیں۔ لیکن دواوین میں ردیف ہائے ہوز ہی میں لاتے ہیں۔ اہل لکھنؤ بات۔ رات وغیرہ کے قافئے میں ہات کبھی نہیں لکھتے۔ یہ اجتہاد حال میں اہل دہلی نے کیا ہے ؎

ہجر کی شب کس بلا کی رات ہے ۔۔۔ ایک میں ہوں یا خدا کی ذات ہے
ضعف سے اُٹھتے نہیں دستِ دُعا ۔۔۔ اب ہماری شرم اُس کے ہات ہے } داغ دہلوی

دعائے مرگ اثر سے جا پھڑے یارب شبِ ہجراں
اندھیرے میں بڑا موقع ہے دو دو ہات کرنے کا۔ } راسخ دہلوی

جناب جلال لکھنوی نے ہونٹھ اور پیٹھ کی ہا سے مخلوط کو تو غیر فصیح سمجھا۔ مگر ہاتھ کی خبر نہ لی۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو۔ کہ اہل دہلی اس لفظ میں پہلے ہی ترمیم کر چکے تھے۔ اب یہ بات خودداری کے خلاف تھی۔ کہ جناب جلال اہل دہلی کی ہاں میں ہاں ملاتے ؛

ہرن کا کالا ہو جانا۔ شدتِ گرما یا حدتِ آفتاب سے ہرن کا سُست پڑ جانا ؎

گرمی رخسار سے بیمار ہو گی چشمِ یار ۔۔۔ دھوپ کی شدت سے آہو کالا ہو جائیگا (ناسخ لکھنوی)

جناب ناسخ مغفور کا ایک اور مصرع ہے۔ ؎

مثل آہو پھرتے پھرتے دھوپ میں کالے ہوئے

ان ہر دو محاورات کے استعمال میں یہ فرق ہے۔ کہ اہل لکھنؤ دونوں طرح استعمال کرتے ہیں۔ مگر اہل دہلی صرف ہرن کا کالا ہو جانا بولتے ہیں ؛

ہتھواسنا۔ تلوار کا بارادۂ جنگ ہاتھ میں لینا۔ یعنی دست بقبضہ ہونا۔ یہ محاورہ لکھنؤ سے مخصوص ہے۔ دلی میں نہیں بولا جاتا ؛

ہڈیوں کا مالا ہو جانا۔ نہایت لاغر و ناتوان ہونے سے عبارت ہے ؎

جُدا کیا اپنے دم سے ہجر میں ہوتا تنِ لاغر
یہ مالا ہڈیوں کا بھی گلے کا ہار ہونا تھا۔ } بحر لکھنوی

لکھنؤ کا محاورہ ہے۔ گو اہل دہلی اس طرح نہیں بولتے۔ مگر یہ محاورہ ہندوستان میں عموماً رائج ہے ؛

ہمکارا۔ کسی بات کے قبول کرنے کی آواز۔ جیسا کہ اکثر کہانی سننے والے ہوں ہوں کیا کرتے ہیں۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔ اہل دہلی ہُنکارا کہتے ہیں
ہونٹھ۔ اس لفظ کے متعلق خواجہ اشرف علی لکھنوی نے اپنی کتاب مصطلحات اردو میں یہ رائے ظاہر کی ہے۔ کہ سرمایۂ زبان اردو میں جلال لکھتے ہیں۔ ہونٹھ نادرست ہے۔ ہونٹ صحیح ہے۔ جلال اپنے دعوے پر کوئی دلیل نہیں لائے۔ بلکہ اپنے اُستاد الاستاد سے اعراض کیا۔ ناسخ کی غزل موجود ہے۔ جس کا مقطع یہ ہے ؎

آبِ حیات بن گئی ناسخ شراب صاف ۔ جب اُس نے جام آب سے اپنے لگائے ہونٹھ

صاحب نفائس اللغات کے نزدیک بھی ہونٹھ صحیح ہے۔ اور اکثر شعرا اس پر متفق ہیں شیخ ناسخ ہی کا لکھنا صحیح ہے۔ معلوم ہوا کہ جناب جلال لکھنوی کے سوا لکھنؤ کے دیگر شعرا ہونٹ کی فصاحت کے قائل نہیں۔ انفرادی صورت میں اہل دہلی بھی عموماً ہونٹھ ہی بولتے ہیں۔ البتہ جمع کی حالت میں کبھی کبھی ہونٹوں بھی کہہ جاتے ہیں*

حرفِ ی

یادگار۔ یہ لفظ لکھنؤ میں عموماً مذکر اور دہلی میں مونث بولا جاتا ہے۔
یہاں۔ کلمۂ ظرف۔ جیسے اس جگہ۔ اُن کے یہاں۔ ہمارے یہاں۔ آخر کی دونوں صورتوں میں اہل دہلی کا اختلاف ہے۔ وہ اُن کے ہاں اور ہمارے ہاں بولتے ہیں ؎

رواج پائے نہ پائے کچھ اس سے بحث نہیں
وفا کی رسم نئی ان کے ہاں نکلتی ہے * } (داغ)

تذکیر و تانیث

اردو زبان میں جس طرح اور بہت سے مستثنیات اور خلاف قواعد امور ہیں۔ اسی طرح تذکیر و تانیث کا مسئلہ بھی کسی قدر پیچیدہ و لاینحل ہے۔ اردو میں مونث کی شناخت کے لئے قدیم الایام سے (برائے نام) یہ قاعدہ چلا آتا ہے۔ کہ جس حرف کے آخر میں یائے معروف ہوگی۔ وہ عموماً مونث سمجھا جائیگا جیسے ارھی۔ کنگھی۔ گوبھی۔ روٹی۔ چٹنی وغیرہ۔ مگر یہ قاعدہ بطور کلیہ ہر لفظ کی تذکیر و تانیث پر موثر نہیں۔ بلکہ جیسا پیشتر ظاہر کیا جا چکا ہے۔ ایک برائے نام من سمجھوتی کا ذریعہ ہے۔ ایک اسی قاعدے میں مستثنیات کا وہ طوفان نظر آتا ہے۔ جس کو دیکھ کر اس قاعدے کو قاعدہ کہنا ایک طرح کی ہنسی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ایسے الفاظ بہت سے پائے جاتے ہیں جن کے آخر میں یائے معروف تو ہے مگر عموماً "مذکر" بولے جاتے ہیں۔ جیسے پانی۔ موتی۔ گھی۔ دہی۔ ہاتھی وغیرہ۔ اب یہاں وہ قاعدہ ہرگز نہیں چل سکتا۔ یعنی روٹی اور کنگھی کے قیاس پر موتی اور گھی وغیرہ کو مونث نہیں کہہ سکتے۔ اردو کے بعض نادان دوستوں کا خیال ہے۔ کہ اگرچہ پانی گھی وغیرہ الفاظ قدیم الایام سے "مذکر" لکھے اور بولے جاتے ہیں۔ مگر اس قاعدے کے تحت میں لانے کی غرض سے کیا ہرج ہے اگر ان کو بھی اہل زبان مونث ہی استعمال کرنے لگیں۔ یہ رائے بظاہر تو بہت دلخوش کن معلوم ہوتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس پر عملدرآمد کرنے سے زبان کی فصاحت قایم نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ یہ الفاظ دہلی و لکھنؤ میں قدیم سے مذکر بولے جاتے ہیں۔ اور ہندستان میں کوئی زباندان ان کو مونث نہیں کہتا + اگر کوئی شخص "ٹھنڈا پانی" کی جگہ "ٹھنڈی پانی" کہے۔ یا "اچھا گھی" کے بدلے "اچھی گھی" بولے تو سب اہل زبان و زباندان اس کو مخبوط الحواس

سمجھیں گے۔ اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے۔ کہ جن اسماء کے آخر میں یائے
معروف ہو وہ مونث بولے جایا کریں۔ تو یہ قاعدہ بھی چلتا نظر نہیں آتا۔ کیونکہ
بعض اسماء اردو زبان میں بھی ایسے پائے جاتے ہیں کہ جن کے آخر میں یائے معروف
تو ہے۔ مگر ان کی تانیث کسی طرح ممکن نہیں۔ جیسے دھوبی۔ تیلی۔ تنبولی۔ درزی
بھنگی۔ جوگی وغیرہ۔ اسی طرح ایسے الفاظ بھی بکثرت ہیں۔ جن کے آخر میں یائے
معروف ہے اور مونث کہلاتے ہیں۔ جیسے جُلاہی۔ لوہاری۔ چماری۔ سُناری
وغیرہ۔ مگر چونکہ یہ الفاظ قاعدے کے مطابق ہیں۔ اس لئے ان پر کچھ اعتراض
نہیں ہوسکتا۔ یہاں ان الفاظ کے لکھنے سے ہماری غرض صرف یہ ہے۔ کہ
جن الفاظ کے آخر میں یائے معروف ہے وہ تذکیر و تانیث میں قریب برابر
پہلو مارتے چلے جاتے ہیں۔ مگر ان الفاظ کی تانیث میں بھی اہل دہلی و اہل لکھنؤ کا
باہم اختلاف پایا جاتا ہے۔ یعنی جن مذکر الفاظ کے آخر میں یائے معروف کے علاوہ
کوئی اور حرف ہو (اور وہ الفاظ پیشہ وروں سے تعلق رکھتے ہوں) تو اہل دہلی
ایسے الفاظ کے آخر میں یائے معروف بڑھا کر تانیث کا کام نکال لیتے ہیں۔ جیسے جلاہا
سے جُلاہی۔ سُنار سے سُناری۔ لوہار سے لوہاری۔ بھٹیارا سے بھٹیاری۔ کہار
سے کہاری وغیرہ مگر لکھنؤ میں یہ قاعدہ نہیں۔ وہاں کے اصحاب ان مذکر الفاظ کے
آخر میں ن بڑھا کر مونث بناتے ہیں۔ جلاہا سے جُلاہن۔ سُنار سے سُنارن۔ کہار
سے کہارن وغیرہ۔ یہ ن بڑھا کر مونث بنانے کا قاعدہ دلی میں بھی رائج ہے۔ مگر
وہاں اس کا عمل صرف اسی مذکر لفظ پر کیا جاتا ہے جس کے آخر میں یائے معروف
ہو۔ جیسے تیلی سے تیلن۔ دھوبی سے دھوبن۔ تنبولی سے تنبولن۔ درزی سے
درزن۔ بھنگی سے بھنگن وغیرہ اس تحریر میں یہی فرق دکھانا مقصود تھا۔
اس کے علاوہ دہلی و لکھنؤ کی زبان میں یہ بھی فرق ہے کہ اہل دہلی مونث عربی